ماہنامہ

حکمتِ قرآن

لاہور

وَأَنزَلْنَا الْحَدِيدَ فِيهِ بَأْسٌ شَدِيدٌ وَمَنَافِعُ لِلنَّاسِ

(الحدید : ۲۵)

اور ہم نے لوہا اتارا

جس میں جنگ کی بڑی قوت ہے

اور لوگوں کے لیے بڑے فوائد بھی ہیں۔

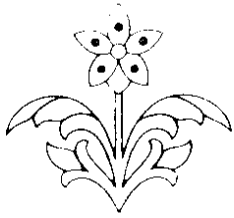

اتفاق فاؤنڈریز لمیٹڈ

۳۲۔ ایمپریس روڈ۔ لاہور

وَمَن يُؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ أُوتِيَ خَيْرًا كَثِيرًا

(البقرہ: ۲۶۹)

ماہنامہ

حکمتِ قرآن

لاہور

جاری کردہ: ڈاکٹر محمد رفیع الدین ایم اے، پی ایچ ڈی، ڈی لٹ، مرحوم

مدیر اعزازی: ڈاکٹر ابصار احمد ایم اے، ایم فل، پی ایچ ڈی،

معاون مدیر: حافظ عاکف سعید، ایم اے (فلسفہ)

جلد ۴	جنوری ۱۹۸۶ء بمطابق ربیع الثانی ۱۴۰۶ھ	شمارہ ۱

— یکے از مطبوعات —

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

۳۶-کے، ماڈل ٹاؤن - لاہور ۱۴

فون: ۸۵۲۶۱۱

سالانہ زرِ تعاون -/۳۰ روپے — فی شمارہ -/۳ روپے

مطبع: آفتاب عالم پریس ہسپتال روڈ لاہور

مضمون نگار حضرات کی آراء سے ادارہ کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔

فہرس

حرفِ اوّل ــــــــــــ ۳
عاکف سعید

حکم و عبر ــــــــــــ ۴
"فَهَلْ مِنْ مُدَّكِرٍ؟"
مولانا محمد سعید الرحمٰن علوی

اُمتِ مسلمہ کے لیے لائحہ عمل (۳) ــــــــــــ ۱۱
سورۂ آل عمران آیات ۱۰۲ تا ۱۰۴ کی روشنی میں
ڈاکٹر اسرار احمد کا ایک خطاب

قرآنِ مجید کی اخلاقی اور قانونی تعلیمات ــــــــــــ ۲۱
مولانا محمد طاسین

مولانا عبید اللہ سندھی۔ اور اُن کی تفسیر "المقام المحمود" ــــــــــــ ۳۵
مولانا محمد سعید الرحمٰن علوی

مغربی نظامِ وکالت کی اصلاح ــــــــــــ ۵۸
چند اہم تجاویز
مولانا بشیر احمد

ایک مجاہد عالم اور درویش ــــــــــــ ۶۷
علامہ سید سلیمان ندویؒ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حافظ عاکف سعید

حرفِ اوّل

جنوری ۱۹۸۶ء کا شمارہ پیشِ خدمت ہے! ——— ۱۹۸۵ء رخصت ہو چکا ہے اور ۸۶ء کا سورج طلوع ہو چکا ہے لیکن وقت کا دریا اسی روانی سے بہہ رہا ہے۔ کسی سال کے اختتام ہونے یا نئے سال کے شروع ہونے کا عمل وقت کے دریا کی روانی پر قطعاً اثر انداز نہیں ہوتا۔ لمحات منٹوں میں، منٹ گھنٹوں میں، گھنٹے دنوں میں اور دن سالوں میں ڈھلتے چلے جاتے ہیں لیکن اس تبدیلی کے عمل میں کہیں کوئی Jerk یا تغیر کا احساس نہیں ہوتا ——— وقت یا زمان کی حقیقت و ماہیت کیا ہے! یہ ایک انتہائی دقیق اور پیچیدہ مسئلہ ہے، ہر دور میں حکماء و فلاسفہ نے اس گتھی کو سلجھانے کی کوشش کی ہے لیکن واقعہ یہ ہے اس کی کنہ تک پہنچنا آسان نہیں! بلکہ شاید یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ زمان و مکان کی حدود میں رہتے ہوئے کسی کے لئے اس کی حقیقت کو کماحقہٗ (As Such) جاننا ممکن ہی نہیں[1]! تاہم ہر شخص، خواص میں سے ہو خواہ عوام کے طبقات سے متعلق ہو، وقت کے بارے میں ایک نوع کا احساس ضرور رکھتا ہے۔ وہ اسے ماضی، حال اور مستقبل کے حوالے سے جانتا ہے 'زمانہ' کے عنوان سے جو نظم بالِ جبریل میں شامل ہے اس کے پہلے شعر میں اقبال نے اسی حقیقت کو بڑی خوبصورتی سے شعر کے سانچے میں ڈھالا ہے کہ ؎

جو تھا نہیں ہے، جو ہے نہ ہوگا یہی ہے اک حرفِ محرمانہ
قریب تر ہے نمود جس کی اسی کا مشتاق ہے زمانہ !!

اسی طرح ہر شخص اس آفاقی حقیقت سے بھی بخوبی آگاہ ہے کہ وقت کسی کا انتظار نہیں کیا کرتا! اس حقیقت کی تعبیر بھی اقبال نے جس پیرائے میں کی ہے وہ بلاشبہ انہی کا حصہ ہے۔

نہ تھا اگر تو شریکِ محفل قصور میرا ہے یا کہ تیرا
مرا طریقہ نہیں کہ رکھ لوں کسی کی خاطر مئے شبانہ

اسی نظم کے ایک شعر میں اقبال نے اس حقیقت کا اظہار کیا ہے کہ اس گردشِ لیل و نہار کا جو اصل

(باقی صفحہ ۷۲ پر)

---

[1] مولانا معین الدین اجمیریؒ نے "مسئلہ دہر" پر کلامی انداز میں مفصل بحث کی ہے۔ آئندہ کسی اشاعت میں ان شاء اللہ ان کے عالمانہ مضمون کو شائع کر دیا جائے گا۔ مولانا موصوف پر ایک تعارفی مضمون اسی شمارے میں شامل ہے۔

محمد سعید الرحمٰن علوی

حِکَو عبَر

۱۹۴۷ء سے ۱۹۷۱ء تک اور ۱۹۷۱ء سے ۱۹۸۵ء تک
فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ

دسمبر کا مہینہ آتا ہے تو دل و دماغ ہل کر رہ جاتے ہیں - ابھی یہ مہینہ کیا آیا کہ اضطراب و بے چینی نے گھیر لیا۔ رات کو چین ہے نہ دن کو آرام — جانِ مجنون کو دوہرا عذاب ہے، ۱۴ سال قبل مڑ کر دیکھتا ہوں تو مشرقی پاکستان "بنگلہ دیش" بنتا نظر آتا ہے اور حال پر نظر جاتی ہے تو چاروں طرف اسلامی روایات اور اخلاقی اقدار کا جنازہ اٹھتا نظر آتا ہے - یہ حالت دوہرے رنج اور صدمہ کا باعث بنتی ہے، دل پر چوٹ لگتی ہے اور پریشانی کے عالم میں کھو کر رہ جاتا ہوں۔

یہ خطہ جسے اللہ تعالےٰ نے صدیوں قبل اسلام کے نور سے روشن کیا تھا اور جسکے بعض حصوں میں حضور اقدس محمد عربی علیہ السّلام کے دوہرے داماد، خلافتِ راشدہ کے تیسرے ستون، امت کے محسن، سیدنا عثمان غنی رضی اللہ تعالےٰ عنہ کے دور میں اسلام کا نورانی پیغام پہنچ چکا تھا، کئی صدیوں تک مسلمانوں کی عظمت و شوکت کا گہوارہ بنا رہا - علم، تقویٰ، حکومت و فرمانروائی سبھی کچھ اس خطہ میں موجود تھی اور بافراط، لیکن تنزل و ادبار کی آندھی آئی تو کایا کلپ ہو کر رہ گئی اور ۱۸۵۷ء کے سال میں تو ملّت مکمل طور پر غلامی کے شکنجہ میں کس کر رہ گئی۔

غازی اورنگ زیب عالمگیر مرحوم کے بعد سے ہی موسم کے آثار اچھے نہ تھے لیکن کسی کی توجہ نہ تھی، توجہ تھی تو امام ولی اللہ الدھلوی رحمہ اللہ تعالیٰ کی جو دہلی میں بیٹھے قوم کو سمجھانے بجھانے کی فکر میں تھے، ان کی دردمندی اور جذبہ نُصح و خیر خواہی منتقل ہوا ان کے صاحبزادگان و خدّام میں، انہوں نے ہر جتن کیا، ہر پاپڑ بیلا، حتیٰ کہ دوسری نسل نے پوری بے جگری سے خون کا نذرانہ بھی دیا لیکن فصل بہاری روٹھ چکی تھی، آسمان کی آنکھیں پھر چکی تھیں، بخت ہم سے روٹھ چکا تھا، اس لئے ہر تدبیر الٹ گئی اور دوا نے مطلق کام نہ کیا۔

سیاہ بختی کی چادر پوری طرح ۱۸۵۷ء میں تن گئی - یاروں نے نمک پاشی کا دھندا اس طرح شروع کیا کہ اس سَن کو غدر کا سَن کہنے لگے اور اپنے بخت و مقدر کی تاریکی کو دشنی میں بدلنے

کی جدوجہد کرنے والوں کو غادر، باغی اور نہ معلوم کیا کیا کہنے لگے۔
۱۸۵۷ سے ۱۹۴۷ تک نوّے برس کا عرصہ جس کشمکش، پریشانی اور اضطراب میں گذرا، اس کا آج کس کو اندازہ ہے، جانی و مالی نقصان کس حد تک ہوا، اجاڑ کی کیا کیا شکلیں پیش آئیں، ان کا تصور ہی مشکل ہے — کہا جا سکتا ہے اور یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ بغداد و غرناطہ کی تباہی کے بعد اور ان حکومتوں کے زوال کے بعد گویا یہ تیسرا نہایت درجہ وحشت ناک اور المناک صدمہ تھا، جس سے اسلام کے نام لیواؤں کو دوچار ہونا پڑا۔ ملک معتصم پر آسمان کو خون بہانے کا حق تھا اور یقیناً تھا تو اس حادثہ پہ آسمان گر پڑتا اور زمین پھٹ جاتی تو بالکل بجا ہوتا۔ جس ظلم و بربریت کی ابتداء ۹ رمئی ۱۸۵۷ء کو میرٹھ شہر کے جیل خانہ سے ہوئی۔ اس کا مظاہرہ ان نوّے سالوں کے ہر دن میں ہوا اور معلوم ہوتا تھا کہ اللہ تعالےٰ کی زمین ان تیرہ بخت انسانوں پر تنگ ہو چکی ہے اور ان کا کوئی ملجا و ماویٰ نہیں۔

لیکن ۱۹۴۷ء — میں بالآخر ظلم کی یہ سیاہ رات ختم ہوئی، وحشت و بربریت کا دور تمام ہوا، اور آزادی کی صبح طلوع ہوئی لیکن اسطرح کہ ملک تقسیم ہو گیا اور ہندوستان و پاکستان کے نام سے اس کے دو حصے ہو گئے، ہندوستان کا اقتدار کانگریس کو ملا۔ اور پاکستان کی مقتدر جماعت مسلم لیگ قرار پائی جس کے سربراہ جناب محمد علی جناح تھے۔
بہت سے مسلمان جن میں علم و صلاح کے اعتبار سے بعض چوٹی کے لوگ تھے اس تقسیم کے عمل پر خوش نہ تھے اُن کے نزدیک اس کے اسباب کیا تھے اور اُن کا موقف کس حد تک صحیح تھا، یہ ہمارا موضوع نہیں، یہ قصہ اب تاریخ کے سپرد ہو چکا ہے اور تاریخ ہی اس کے متعلق فیصلہ کرے گی۔

ہماری گفتگو کا رُخ اس وقت پاکستان کے سلسلہ میں ہے، جس کی بنیاد "دو قومی نظریہ" قرار پایا۔ آج بہت سے طبقے اور عناصر مختلف افراد و رجال کار کے سلسلہ میں دعوے دار ہیں کہ اس "دو قومی نظریہ" کے وہ بانی تھے، ایک طبقہ بریلی کے معروف عالم جناب مولوی احمد رضا خاں صاحب سے متعلق دعوی کرتا ہے لیکن اس دعوی میں بال برابر صداقت اسلئے نہیں کہ مولانا موصوف "جواز شرکت کانگریس" کے زبردست مؤید تھے اور ابھی مسلم لیگ نے اس حوالہ سے اپنی جدوجہد کا آغاز چھوڑ، شاید اس رُخ پر سوچا بھی نہ تھا کہ مولانا

انتقال کر گئے، پھر کس حوالہ سے ان کی متعلق یہ دعویٰ درست ہو سکتا ہے کانگریس کی شرکت کے جواز سے لیکر مسلم لیگ اور اس کے اکابر و زعماء کے متعلق اُن کے اور اُن کے نام لیواؤں کے تند و تیز فتوی ایسے نہیں جنہیں بھلایا یا نظر انداز کیا جا سکے۔ بخت واتفاق یا پھر بعض لوگوں کی غلط بخشیوں سے اگر یہ پروپیگنڈا کا رُخ کچھ سے کچھ ہے، تو اس سے سچائی بدل نہیں جاتی۔

اس معاملے میں سب سے بلند آہنگ نام ہے تو علامہ سر محمد اقبال مرحوم کا۔ جن کے خطبہ الہ آباد کے حوالہ سے دعویٰ کیا جاتا ہے۔ مرحوم علامہ اقبال نے اپنے بعض خطوط میں جو حال ہی میں دریافت ہو کر شائع ہوئے ہیں، اس موقف کے سلسلے میں کچھ وضاحتیں ذکر فرمائی ہیں جو ان سے منسوب ہے۔ تاہم وطن عزیز پاکستان کے معاملہ میں ان کی سوچ و فکر کے پیمانے بہر حال لائق توجہ اور قابل قدر ہیں۔ انہیں اس تحریک سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ وہ اور تحریک پاکستان لازم و ملزوم ہیں۔ ۱۹۴۰ء کی قرار داد کے بعد وہ زندہ ہوتے تو شاید اس کے سب سے بڑے نقیب ہوتے۔ "روزگار فقیر" میں ان کے سفر انگلستان (بر موقعہ گول میز کانفرنس) کے حوالہ سے جو تفصیلات سامنے آئی ہیں، وہ بھی اسی کا ثبوت فراہم کرتی ہیں۔ اور ان تفصیلات سے معلوم ہوتا ہے کہ برطانیہ عظمیٰ میں ۱۸۵۷ء کے صرف ایک سال بعد ۱۸۵۸ء میں اس قسم کے خیالات پیدا ہونا شروع ہو گئے تھے کہ ہندوستان کو جب چھوڑنا پڑے تو اس کا انداز کیا ہوگا؟ علامہ اقبال مرحوم نے اس سفر میں بعض دانشوران یورپ کی تحریرات پڑھیں اور بقول سید امجد علی (سابق وزیر خزانہ پاکستان) جو اس سفر میں ان کے ہمراہ تھے، اُن سے انہوں نے گہرا اثر لیا، اور گول میز کانفرنس میں جو تقریر کی وہ انہی نکات کے گرد گھومتی تھی۔ جن میں دو قومی نظریہ کی صدائے بازگشت تھی اور انہی میں مرحوم، مسلمان قوم کے مستقبل کا تحفظ سمجھتے تھے۔ وہ تو تقسیم ملک سے لگ بھگ دس برس پہلے اپنے اللہ کے حضور پہنچ گئے، لیکن اپنے حین حیات جناب محمد علی جناح کو انگلستان سے واپس بلا کر مسلم لیگ کی قیادت ان کے سپرد کر کے ایک طرح کا اطمینان حاصل کر لیا اور پھر اس میں شک نہیں کہ جناح صاحب نے ایک موقف طے کر کے اس کے حصول کے لئے اپنی تمام صلاحیتیں کھپا دیں۔ انہی کی قیادت میں ۱۹۴۰ء میں "قرار داد پاکستان" لاہور میں منظور ہوئی، جس کے بعد مسلم لیگ کا قافلہ ملک

بھر میں اس تیزی سے پھیلا کہ اپنی منزل پر پہنچے بغیر اس نے دم نہ لیا۔ اور اس طرح ۱۹۴۷ء کا سال جہاں برعظیم کی آزادی کا سال قرار پایا وہاں اسے پاکستان کی تاسیس کا سال بھی ہونے کا اعزاز و شرف حاصل ہوا۔

اس بات کا تو اب ذکر ہی عبث ہے کہ اس تقسیم اور پھر تبادلہ آبادی کے عمل میں مسلمان قوم کو مالی اور جانی طور پر کتنی بڑی قربانی دینی پڑی۔ قوموں کی تاریخ میں اس قسم کے مواقع آتے ہی ہیں۔ جب انہیں بہت کچھ قربان کرنا پڑتا ہے، کوئی بڑا مقصد قربانی کے بغیر حاصل نہیں ہوتا، اس لئے اس سوال کو وقتی طور پر نظر انداز کیا جا سکتا ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ نئی نسلوں کو اس نعمت کا احساس دلانے کی غرض سے اگر کبھی کبھار اُن حالات کا ذکر کر دیا جائے تو حرج نہیں۔ بہرحال میں اس وقت تو اس سے صرفِ نظر ہی کرتا ہوں۔ ہاں یہ ضرور عرض کروں گا کہ ہم نے سیاسی اغراض و مقاصد کی خاطر تاریخی طور پر مجرم ضمیر اور مجرم پیشہ قوم سکھوں کے معاملہ میں جس "مروت و محبت" کا مظاہرہ کیا یا کر رہے ہیں، وہ بہرحال تکلیف دہ ہے اور اس سے احساس ہوتا ہے کہ شاید ملّی غیرت و احساسِ قوم سے ہم لوگ محروم ہو گئے ہیں۔ تسلیم کہ ہندو ہمارا دشمن ہے لیکن سکھ کا دامن جس طرح خونِ مسلم سے داغدار ہے اس سے صرفِ نظر بھی انصاف نہیں۔

۱۹۴۷ء میں پاکستان بن جانے کے بعد مسلمان قوم کی غالب اکثریت نے سکھ اور چین کا سانس لیا، اس لئے کہ وہ اپنے ملک میں آزادانہ طریق سے زندگی کے شب و روز گذار سکیں گے۔ لیکن ہوا یہ کہ جوں جوں وقت گذرتا گیا۔ لوگوں کی مایوسی بڑھتی گئی اور لوگ شاعر کی زبان میں کہنے لگے۔

اگر یہ جانتے چن چن کے ہم کو توڑیں گے ۔۔۔ تو گل نہ کبھی تمنائے رنگ و بو کرتے

ملک کی پہلی قیادت نے اپنی پہلی تقریر میں جس رواداری کا مظاہرہ کیا اور بار بار کرایا کہ اب اس ملک میں مسلم غیر مسلم کا کوئی سوال نہ ہوگا، اس کی وجہ سے جو دستوری الجھنیں پیش آتیں اور جس طرح عملاً پریشانیاں ہمارا مقدر ٹھہریں، اس سے صرفِ نظر محض اس لئے کرنا کہ یہ بات فلاں ابن فلاں کے خلاف جاتی ہے، اسلام کے اُصولِ عدل و اعتدال کے منافی ہے۔ شاید اسی تقریر کا شاخسانہ تھا کہ ملک کی کلیدی اسامیوں پر

چودھری ظفراللہ خاں، جوگندر ناتھ منڈل، جنرل گریسی، سکندر مرزا اور اس قماش کے لوگ مسلط ہو کر رہ گئے۔

مولانا شبیر احمد عثمانیؒ کی مسلسل کاوش سے لیاقت علی خان مرحوم نے "قرارداد مقاصد" پارلیمنٹ سے پاس تو کرا دی لیکن ان کی آنکھیں بند ہوتے ہی پارلیمنٹ توڑ دی گئی اور اس ملک کی عدلیہ کے ایک ذمہ دار فرد نے عدلیہ توڑنے کے اقدام پر مہر تصدیق ثبت کر دی، جیسے حالیہ مارشل لاء کے علمبرداروں کو عدلیہ کے ارکان نے نظریہ ضرورت کے تحت کھل چھٹی دیدی۔

پارلیمنٹ ڈوبی تو ظاہر ہے کہ دستور کا مسئلہ کھٹائی میں پڑ گیا اور بڑی مشکل کے بعد ۱۹۵۶ء میں جیسا کیسا دستور بنا تو اسے بھی چلنے نہ دیا گیا، حتیٰ کہ بیوروکریسی کے جو افراد اقتدار سے لذت آشنا ہو چکے تھے، انہوں نے مارشل لاء کی راہ ہموار کر دی اور ۱۹۵۸ء میں ملک مارشل لاء کا شکار ہو گیا۔ عام لوگوں کے نزدیک یہ پہلا مارشل لاء ہے لیکن فی الحقیقت یہ دوسرا مارشل لاء تھا؛ پہلا مارشل لاء وہ تھا جو ۱۹۵۲ء میں لگایا گیا گو جزوی طور پر! اور یہ اس وقت کا قصہ ہے جب امت مسلمہ مرزائیوں کا دستوری مقام متعین کرانے کی غرض سے سرگرم عمل تھی، آج کے "علمبردار جمہوریت" جنرل اعظم خاں نے سیاست دانوں کی حکومت کا اشارہ پاتے ہی فوج کے ذریعے غلامان بارگاہ رسالت کو اس طرح کچلا کہ الامان۔ اہل سیاست اور عسکری حضرات کی اس موقعہ پر ملی بھگت ہمیشہ ہی رنگ لاتی رہی اور جب ایوب خان فوجی رہنما بن کر سامنے آئے تو ان کے اقتدار کے تحفظ کے لئے منظور قادر اور ذوالفقار علی بھٹو جیسے حضرات اس بزم و مجلس میں برابر کے شریک تھے۔

ایوب خان کے بعد یحییٰ خاں کے دور میں اسے بھی اور اب جناب ضیاء الحق کو بھی ابتداء سے ہی اہل سیاست کا تعاون و آشیرباد حاصل ہے، جس کا معنی یہ ہے کہ اہل سیاست اور عسکری حضرات کا باہم تعلق ہمیشہ رہا، اور انہیں سے کسی ایک طبقہ کو مجرم قرار دینا صحیح نہیں بلکہ یہ گناہ دونوں طبقات کا مشترکہ گناہ ہے۔ تقسیم کے فوراً بعد ہی ایک جنگ سے ہمیں پالا پڑا جس کا ٹارگٹ کشمیر تھا مولانا مودودی نے اس جنگ کو اسلامی جہاد کے بجائے قومی جنگ قرار دیا تھا جس پر مولانا شبیر احمد عثمانیؒ میدان میں

آئے اور انہوں نے اسلامی جہاد ثابت کیا، دوسری جنگ ۱۹۶۵ء کی تھی، جس کے حوالہ سے اب دو چار سال سے ہمارے ریٹائرڈ فوجی حضرات دھڑا دھڑ مضامین لکھ رہے ہیں جنہیں پڑھ پڑھ کر ہر آدمی پریشانی کا شکار ہو رہا ہے۔ تاہم یہ بات اپنی جگہ درست ہے کہ اس جنگ کے موقعہ پر کسی درجہ میں ہماری قوم کا قبلہ درست ہو گیا تھا اور اسکی صفوں میں کافی حد تک اصلاح کی شکل پیدا ہو گئی تھی لیکن پھر جو ملک میں بُدھ رچا تو ۱۹۷۰ء کا انتخاب اتنی بڑی بربادی لے کر سامنے آئے کہ ۱۹۴۷ء کا پاکستان کم و بیش ۲۴ برس بعد دولخت ہو گیا اور مسلمانوں کی تاریخ میں اتنی بڑی عبرت آمیز شکست سے ہمیں دوچار ہونا پڑا۔ ہم نے اپنے مطالعہ کے دوران ایک صاحب نظر انسان کی ایک تحریر دیکھی جس میں انہوں نے ان اسباب کو گنوایا ہے جو کسی قوم کا "اسلامیت" سے رشتہ کمزور کرنے کا باعث بنتے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ انہوں نے زوال پذیر قوموں کا ٹھیک ٹھیک تجزیہ کیا اور بڑے صاف لفظوں میں مرض کی نشاندہی کر دی۔

ان اسباب چہارگانہ میں پہلا سبب مشرکانہ عقائد و اعمال ہیں جو قرآن کی نصوص قطعیہ کی رُو سے ہمیشہ ضعف، مرعوبیت، جُبن، بزدلی اور اللہ تعالیٰ کی نصرت سے محرومی کا سبب بنتے ہیں۔

دوسرا سبب انتشار و افتراق ہے جس کا انجام نص قرآنی کے مطابق ہوا کا اکھڑنا اور سست و کمزور پڑ جانا ہے۔

تیسرا سبب دولت کی حد سے بڑھی ہوئی محبت اسکو ہر قیمت پر حاصل کرنے کا جذبہ، اسراف و تبذیر، خود ساختہ رسوم کی پابندی اور ان معاملات میں تفاخر و مسابقت کا جذبہ ہے جو احادیث صحیحہ کی روشنی میں بے حد مفاسد کا سبب بنتا ہے اور جس کے بعد کوئی قوم حالات کا مقابلہ نہیں کر سکتی، بلکہ وہ بھیڑوں کا گلہ ہوتا ہے جسے جو چاہتا ہے کسی کی طرف ہانک کر لے جاتا ہے بالفاظ صحیح وہ "بلبلۂ آب" جو لمحہ بھر کو سطح آب پر ابھرتا اور پھر فنا ہو جاتا ہے۔

چوتھا سبب "جذباتیت" ہے اور جب خاص طور پر وہ جماعتی یا علاقائی مزاج بن جائے تو وہ چند در چند خطرات کا سبب بنتی ہے۔ دنیا کے نقشے پر ابھرنے والی قوموں کی خوبیاں تحمل، بردباری، عالی ظرفی، فقیر غیور اور اس کا بہادرانہ مزاج اور جہد مسلسل

کا جذبہ ہوتا ہے ۔

ہم نے ان اسباب پر جونہی نظر ڈالی اور پھر ۱۹۷۰ء/۱۹۷۱ کے حالات کا جائزہ لیا تو ہمیں ان میں سے ایک ایک سبب اپنے اندر نظر آیا اور آیا کیا اب بھی دیکھیں تو یہی نظر آئیں گے ۔ جس کا معنی یہ ہے کہ اتنے بڑے حادثہ کے بعد ہمارے اندر عقل نہیں آئی، ہماری سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں غارت ہو کر رہ گئی ہیں اور ہمارا حال ان قوموں جیسا ہو گیا ہے ۔ جو فکرِ فردا سے بے نیاز ہو کر رہ جاتی ہیں، جن کا احساسِ قوم مر جاتا ہے، جو اپنے آپ کو حالات کے حوالے کر دیتی ہیں اور جو اصلاحِ احوال کی ہر کوشش کا تمسخر اڑانا اپنا مقصد بنا لیتی ہیں ۔

۱۶ دسمبر ۱۹۷۱ء کو ریڈیو پاکستان کے پونے پانچ بجے کے بلیٹن نے پلٹن میدان ڈھاکہ میں جنرل نیازی جیسے سورماؤں کے ہتھیار ڈالنے کی خبر نشر کی تھی، جس خبر کے بنانے میں راؤ فرمان کی ڈپلومیسی اور جنرل ٹکا کی خون آشامی شامل تھی یحییٰ خان کی محفلِ شاہد و شراب جس کا باعث تھی اور چھوٹے اہلِ سیاست کا بچگانہ کھیل شامل تھا ۔ اس خبر کے حوالے سے ہم ملک کے بڑوں چھوٹوں کو توجہ دلاتے ہیں اس طرف، کہ وہ جائزہ لیں کہ جو اسباب و عوامل چہارگانہ اس وقت ہماری خانماں بربادی کا باعث بنے تھے، ان کا ازالہ ہم نے کیا یا وہ پھیل کر اب ناسور بن گئے ہیں ؟ ہمارے خیال میں دوسری شکل نظر آ رہی ہے اور جب ایسا ہو تو پھر ہم سب کا اللہ حافظ ۔ اس سے پہلے کہ قضا و قدر کا فیصلہ صادر ہو ہمیں بارگاہِ ایزدی میں توبہ کر کے اپنی اصلاح کا سامان کر لینا چاہیے ۔

فھل من مدکر ؟

عَنْ عُثْمَانَ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ

خَیْرُکُمْ مَنْ تَعَلَّمَ الْقُرْاٰنَ وَعَلَّمَہٗ

اُمّتِ مُسلمہ کے لیے لائحہ عمل (قسط ۳)

(سورۃ آل عمران کی آیات ۱۰۲ تا ۱۰۴ کی روشنی میں)

ڈاکٹر اسرار احمد کا ایک اہم خطاب

اب میں آپ سے درخواست کروں گا کہ تیسری آیت کی تشریح و توضیح پر اپنی توجہات کو پوری طرح مرتکز فرمائیے۔ آیت مبارکہ ہے: وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ ۭ وَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝ اس آیتِ مبارکہ پر غور و فکر کرنے سے قبل میں چاہوں گا کہ بطور مقدمہ ایک اہم بات ذہن نشین فرمالیں۔

ہم نے اب تک ان دو آیات کا مطالعہ کیا ہے کہ: يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ۝ وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا ..... الخ ــــ ان کے مطالعہ سے یہ بات نکھر کر سامنے آتی ہے کہ یہاں جو ہدایات دی گئی ہیں وہ ایک اجتماعیت کی متقاضی ہے اور ان پر اگر پُرخلوص و اخلاص اور نیک نیتی کے ساتھ واقعتاً عمل کیا جائے تو اس کے نتیجہ میں لازماً ایک 'اجتماعیت' وجود میں آتی ہے۔ اب آپ سے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ اجتماعیت کس مقصد کے لئے درکار ہے؟ ظاہر بات ہے کہ ہر کام کا کوئی نہ کوئی مقصد ہوتا ہے۔ آپ کوئی چھوٹی سی انجمن بناتے ہیں تو اس کے اغراض و مقاصد معین کرتے ہیں۔ کسی مسجد کے لئے کوئی منتظمہ کمیٹی بناتے ہیں تو اس کے بھی اغراض و مقاصد اور قواعد و ضوابط بنائے جاتے ہیں۔ لہٰذا غور طلب بات یہ ہے کہ حبل اللہ سے جُڑ کر جو جمعیت وجود میں آئے گی اس کا مقصد کیا ہوگا!

یہ ہے وہ بات جس کی اس آیت میں وضاحت فرمائی گئی کہ: وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ ۭ۔ اس آیت کے دو ترجمے کئے گئے ہیں۔ بعض کے نزدیک یہاں "مِنْ" بیانیہ ہے اور بعض کے نزدیک تبعیضیہ ہے۔ یہ دونوں لغوی اصطلاحات ہیں ان سے ترجمہ میں جو فرق واقع ہوتا ہے اسے سمجھئے۔ مقدم الذکر تاویل کے اعتبار سے ترجمہ یہ ہوگا "تم سے ایک ایسی امت وجود میں آنی چاہیئے"۔ اور اگر یہاں مِنْ کو تبعیضیہ سمجھا جائے تو

ترجمہ ہوگا "تم میں سے ایک ایسی امّت وجود میں آنی چاہیئے"۔ میرے نزدیک یہ دونوں ترجمے صد فیصد درست ہیں۔ مسلمان سب کے سب مل کر ایک امّت بن جائیں جن کا کام کیا ہو۔ یَدْعُوْنَ اِلَی الْخَیْرِ وَیَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَیَنْھَوْنَ عَنِ الْمُنْکَرِ۔ یہ تو ہو جائے گی اس ترجمہ کی وضاحت کہ "تم سے ایک ایسی امّت وجود میں آنی چاہیئے جو یہ یہ کام کرے"۔ لیکن چونکہ اس مضمون کی آیت اسی سورہ آل عمران میں آگے موجود ہے: کُنْتُمْ خَیْرَ اُمَّۃٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْھَوْنَ عَنِ الْمُنْکَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰہِ[1] لہٰذا اکثر مفسرین کی رائے میں یہاں 'مِنْ' بیانیہ نہیں بلکہ تبعیضیہ ہے۔ یعنی اگر صورتِ حال یہ ہو جائے کہ پوری امّت سوگئی ہو، پوری امّت کو اپنی ذمہ داریوں کا احساس نہ رہا ہو، پوری امّت اپنے فرضِ منصبی کو فراموش کر چکی ہو تو اس صورت میں کیا ہونا چاہیئے۔

آگے بڑھنے سے قبل بطور جملہ معترضہ میں ایک بات عرض کر دوں۔ بات تلخ ہے لیکن ہے امر واقعہ! اگرچہ نظری طور پر ہم دنیا کے تمام مسلمانوں پر 'امّت مسلمہ' کے لفظ کا اطلاق کرتے ہیں لیکن فی الحقیقت کوئی ایک 'امّت مسلمہ' اس وقت دنیا میں وجود نہیں رکھتی۔ امّت مسلمہ ہے کہاں! یہاں تو فی الواقع بیشمار قومیں ہیں جن کو مسلم اقوام (Muslim Nations) کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔ علامہ اقبال کے بارے میں ہر شخص جانتا ہے کہ اس صدی میں وحدتِ ملّی کا ان سے بڑا حدی خواں کوئی نہیں تھا ؎

چین و عرب ہمارا ہندوستاں ہمارا — مسلم ہیں ہم وطن ہے سارا جہاں ہمارا!!

اور ؎ ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لئے — نیل کے ساحل سے لے کر تابخاکِ کاشغر

تو اس صدی میں وحدتِ ملّی کے سب سے بڑے حدی خواں یعنی علامہ اقبال کو اپنے لیکچرز 'تشکیلِ جدید الٰہیاتِ اسلامیہ' میں یہ تسلیم کرنا پڑا ہے کہ اس وقت دنیا میں کوئی امّتِ مسلمہ ایک اکائی اور اتحاد کے اعتبار سے موجود نہیں ہے ـــــ بلکہ جو حقیقی یعنی De-facto پوزیشن ہے وہ یہ ہے کہ "مسلمان اقوام" (Muslim Nations) موجود ہیں اور یہ بھی آج سے نصف صدی سے بھی پہلے کی بات تھی۔ اغلباً ۱۹۳۰ء کے علامہ کے لیکچرز ہیں۔ اب صورت یہ ہے کہ کسی ملک میں ایک "قوم" (Nation) نہیں رہی بلکہ وہ بھی کئی قومیتوں کے اندر منقسم ہے۔ دنیا میں پاکستانی ایک قوم شمار کئے جاتے ہیں لیکن آپ کو معلوم ہے کہ صوبوں کی بنیاد پر یہاں پانچ قومیتوں کے تصوّر کو شروع ہی سے

---

[1] ترجمہ: تم سب امّتوں میں سے بہتر ہو جو لوگوں کے لئے بھیجی گئیں۔ اچھے کاموں کا حکم کرتے ہو اور برے کاموں سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان لاتے ہو۔

ابھارا جاتا رہا ہے جس کے نتیجہ میں مشرقی پاکستان بنگلہ قومیت کی بنیاد پر بنگلہ دیش بن گیا اور غیر بنگالیوں مسلمانوں کو وہاں تہ تیغ کیا گیا۔ پھر اس موجودہ پاکستان میں کوئی صوبہ بھی ایسا نہیں ہے جو یہ کہہ سکے کہ اس کے اندر صرف ایک قوم آباد ہے۔ کیا بلوچستان میں جہاں بلوچ ہیں وہاں بروہی نہیں ہیں! کیا وہاں پٹھان موجود نہیں ہیں، کم از کم تین بڑی قومیں اس ایک صوبے کے اندر بستی ہیں۔ یہی معاملہ پاکستان کے بقیہ صوبوں کا ہے ـــــ!! اور تو اور ایک عربی بولنے والے عرب نہ معلوم کتنی قومیتوں میں منقسم ہیں ـــــ

تو حقیقت یہی ہے اگرچہ بڑی تلخ ہے کہ آج 'ایک امتِ مسلمہ' بالفعل موجود نہیں ہے۔ وہ تو ہمارا صرف ایک ذہنی تصوّر ہے کہ امتِ مسلمہ یا امتِ محمد علی صاحبہا الصلوٰۃ والسّلام فی الواقع اپنا وجود رکھتی ہے اور اس ذہنی تصوّر کی بنیاد اس خیال پر ہے کہ جو بھی حضوؐر کا کلمہ پڑھتا ہے وہ حضوؐر کا امتی ہے۔ یہ بات اپنی جگہ بالکل درست ہے۔ لیکن غور کیجئے کہ کیا یہ امت مربوط ہے! کیا اس کی کوئی اجتماعیت ہے! کیا اس میں کوئی ڈسپلن ہے۔ کیا اس میں کوئی کسی کا حکم سننے اور ماننے والا ہے! مجھے افسوس کے ساتھ عرض کرنا پڑتا ہے کہ ایسی صورتِ حال موجود نہیں ہے۔ آج افغانستان میں روسی فوج افغانوں کا قتلِ عام کر رہی ہے۔ کیا اس کے روسی فوج کے ساتھ افغانی فوج نہیں ہے! کیا وہ اپنے بھائیوں کے خون سے اپنے ہاتھ نہیں رنگ رہی! کارمل کے ساتھ روسیوں کے علاوہ افغانی فوج بھی تو ہے۔ جو اپنے ہاتھوں اپنے بھائیوں کے گلے کاٹ رہی ہے۔ ایران اور عراق کی جو جنگ ہو رہی ہے کیا یہ مسلمان کہلانے والے دو ملکوں کی جنگ نہیں! ستم یہ ہے کہ عراق کی قریباً نصف آبادی شیعوں پر مشتمل ہے۔ دنیا جانتی ہے کہ ایران کی غالب اور عظیم ترین اکثریت شیعوں ہی کی ہے۔ لہٰذا مذہبی اعتبار سے عراق کی نصف کے قریب آبادی ایران کی ہم مذہب ہے۔ لیکن چار سال ہونے کو آئے اور یہ جنگ تا حال جاری ہے۔ دونوں اطراف سے شدید مالی و جانی نقصان ہو رہا ہے۔ دوسرے مسلم ممالک کی وہ تمام کوششیں ناکام ہو چکی ہیں جو اس جنگ کو بند کرانے کے لئے کی جا رہی ہیں۔ سُنیوں اور شیعوں کا جو مسلح خونیں تصادم لبنان میں ہو رہا ہے وہ کسی اخبار میں شخص سے پوشیدہ ہے! وہ مظالم جو کبھی عیسائی ملیشیا نے مسلمانوں پر ڈھائے تھے، وہی مظالم شیعہ ملیشیا نے فلسطینی پناہ گزینوں کے کیمپوں پر ڈھائے ہیں۔

یہ تمام ہنگامے بتا رہے ہیں کہ امتِ مسلمہ بالفعل کہیں موجود نہیں ہے۔ لہٰذا ان حالات میں یہ آیت خوب سمجھ میں آتی ہے کہ جب پوری امت سوئی ہوئی ہو، یا مختلف قومیتوں میں بٹی ہوئی ہو یا اس نے مختلف سمتوں کی طرف اپنے اپنے قبلے بنا لئے ہوں تو ایسی صورت میں اس بڑی امت کے اندر کوئی چھوٹی امت لازماً ایسی موجود ہونی چاہیئے جو اس قرآنی ہدایت پر عمل پیرا ہو جو آیہ زیر بحث میں

بیان کی گئی ہے ـــــ وہ ہدایت کیا ہے؟ اس پر گفتگو ذرا آگے چل کر ہوگی۔ ہو سکتا ہے یہاں بعض لوگ چونکیں کہ یہ بڑی امّت کے دائرے کے اندر 'چھوٹی امّت' کا کیا تصوّر ہے! ـــــ آپ نے ریاست میں ریاست (State within state) کی اصطلاح ضرور سنی ہوگی جو لوگ میری عمر کے ہیں یا مجھ سے بڑے ہیں ان کو معلوم ہوگا کہ کانگریس ایک بہت بڑی پارٹی تھی لیکن اس میں فارورڈ بلاک (Forward Block) علاحدہ تھا۔ جو زیادہ انقلابی ذہن رکھتے تھے۔ انہوں نے کانگریس میں شامل ہونے کے باوجود سبھاش چندر بوس کی قیادت میں اپنا جداگانہ بلاک بنا رکھا تھا۔ 'Party within party' کی یہ نظیر استخلاصِ وطن کی تحریک میں موجود رہی ہے ـــــ اسی طرح آج جو امّتِ مسلمہ ہے اور محض ایک نظری حقیقت بن کر رہ گئی ہے جس کی کوئی واقعاتی حقیقت نہیں ہے تو اس بڑی امّت میں ایک چھوٹی امّت ایسے لوگوں پر مشتمل وجود میں آئے جنہوں نے کسی نہ کسی درجہ میں اس سیڑھی پر قدم رکھا ہو جس کا حکم پہلی آیت میں آیا تھا۔ یعنی وہ لوگ دولتِ تقویٰ سے مالامال ہوں ـــــ میں پھر عرض کر دوں کہ تکمیل کا کوئی دعویدار نہیں ہو سکتا ـــــ جو کمی ہو اسے پورا کرنے کی وہ مسلسل کوشش کر رہے ہوں ـــــ اور پھر یہ کہ انہوں نے دوسری آیت کا تقاضا بھی کسی قدر پورا کیا ہو یعنی انہوں نے اپنے آپ کو قرآن سے جوڑا ہو ـــ اب وہ باہم ایک دوسرے سے مل کر ایک اجتماعی طاقت وجود میں لائیں۔ اس اجتماعیت کا مقصد کیا ہو! اس کے لئے یہاں تین چیزوں کا تعیّن کیا گیا!

پہلا مقصد "یَدْعُوْنَ اِلَی الْخَیْرِ"، یعنی دعوت الی الخیر ـــ نیکی اور بھلائی کی طرف لوگوں کو بلانا ـــ دوسرا مقصد نیکی اور بھلائی کا حکم: یَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ ـــــ اب یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ خیر کی دعوت اور خیر کا حکم! کیا یہ ایک ہی چیز ہے جس کا اعادہ کیا جا رہا ہے! معاذ اللہ قرآن مجید میں کسی ایک ہی مقام پر اس طرح کا اعادہ جو تکرار محض کے ضمن میں آئے ممکن نہیں ہے۔ چنانچہ یہاں ہمیں 'دعوت الی الخیر' اور 'امر بالمعروف' کے مصداق کا الگ الگ تعیّن کرنا ہوگا۔ غالب امکان یہ ہے کہ یہاں دعوت الی الخیر سے مراد قرآن کی طرف دعوت ہے۔ چونکہ قرآن کی رُو سے سب سے بڑا خیر خود قرآن ہے۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ سورۂ یونس کی آیات ۵۷ اور ۵۸ میں قرآن مجید نے نہایت پرشکوہ اسلوب سے اپنی عظمت کو بیان کیا ہے۔ مؤخر الذکر آیت کے آخر میں قرآن اپنے متعلق کہتا ہے: هُوَ خَیْرٌ مِّمَّا یَجْمَعُوْنَ ط "یہ جو کچھ جمع کر رہے ہیں وہ (قرآن) ان سب سے بہتر ہے"۔ قرآن مجید دنیوی دولت کو بھی خیر کہتا ہے مثلاً سورہ العٰدیٰت

میں فرمایا: وَاِنَّهٗ لِحُبِّ الْخَیْرِ لَشَدِیْدٌ ۝ یعنی" انسان مال و دولت کی محبت میں بہت شدید ہے۔ لیکن سورہ یونس میں قرآن اپنے لئے کہتا ہے کہ جو کچھ بھی تم دنیوی مال و اسباب جمع کرتے ہیں ان سب سے کہیں قیمتی شے خود قرآن ہے۔ هُوَ خَیْرٌ مِّمَّا یَجْمَعُوْنَ لہٰذا کہا جائے گا کہ یہاں دعوت الی الخیر سے مراد ہے قرآن مجید کی طرف دعوت! ـــــ اور امر بالمعروف اب عام ہو جائے گا نیکی، بھلائی، خیر کی تلقین کرنا، اس کی وضاحت کرنا۔ اس کا مشورہ دینا، اس کا حکم دینا (امر) کے لفظ میں یہ تمام مفاہیم موجود ہیں۔ پہلا امکان اور فرق یا تو یہ ہے:

دعوت الی الخیر اور 'بالمعروف' کے مصداقات میں دوسرا فرق یہ ہے کہ دعوت میں حکم کا پہلو نہیں ہوتا۔ دعوت میں صرف تلقین ہے۔ نصیحت ہے بلکہ خوشامد بھی ہے کہ خدا کے لئے یہ کام بُرا ہے اسے چھوڑ دیجئے اور بھائی یہ کام اچھا ہے۔ آئیے اور اس کو کیجئے۔ اس انداز اور اس طریقہ سے آپ لوگوں کو بلاتے ہیں کہ اگر آپ یہ کام کریں گے تو آپ کو آخرت میں یہ اجر و ثواب ملے گا دعوت کا درحقیقت یہی انداز ہوتا ہے۔ اس میں تحکمانہ انداز نہیں ہوا کرتا۔ لہٰذا یہاں علاحدہ کر دیا گیا: یَدْعُوْنَ اِلَی الْخَیْرِ۔ نیکی کی طرف بلاؤ، بڑی نرمی سے بلاؤ، خیر خواہی کے جذبہ سے بلاؤ۔ چنانچہ حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علیٰ نبینا و علیہما الصلوٰۃ والسلام سے فرمایا گیا تھا۔ اِذْهَبَآ اِلٰی فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰی ۝ فَقُوْلَا لَهٗ قَوْلًا لَّیِّنًا لَّعَلَّهٗ یَتَذَكَّرُ اَوْ یَخْشٰی ۝ دونوں جلیل القدر پیغمبروں کو حکم دیا گیا کہ" فرعون کے پاس جاؤ وہ بڑا سرکش ہو گیا ہے۔" فرعون کون ہے دشمنِ خدا اور خود خدائی کا مدعی۔ مگر حکم دیا جا رہا ہے کہ" لیکن اس سے نرم انداز سے بات کرنا۔ سختی کا انداز اختیار نہ کرنا۔ شاید کہ وہ نصیحت پکڑے اور اس کے دل میں بات اتر ہی جائے" ـــــ تو یہ ہے دعوت کا انداز۔ لیکن اس سے آگے کا قدم ہے" امر بالمعروف" نیکی کا حکم دینا۔ جبکہ دعوت میں حکم کا کوئی پہلو نہیں ہوتا ـــــ غور کیجئے کہ یہ اصطلاح سب سے پہلے کب آئی! سورۂ حج میں جب اہل ایمان کو تمکن فی الارض کی نوید سنائی گئی' اَلَّذِیْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِی الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَ اٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَ اَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَ نَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ" یہ وہ لوگ ہیں کہ جنہیں اگر ہم زمین میں تمکن فی الارض عطا کر دیں، (اقتدار بخش دیں) تو وہ نماز کا نظام قائم کریں گے، زکوٰۃ ادا کریں گے، نیکی کا حکم دیں گے اور بدی سے روکیں گے" ـــــ یہاں تحکم کا انداز ہے نیکی کو قوت کے ساتھ، نیکی کو طاقت کے ساتھ رائج کرنا، نافذ کرنا ـــــ یہ ہے دراصل دعوت سے اگلا قدم!

اب تیسری بات پر آئیے۔ جو بدقسمتی سے ہمارے بہت سے نیک لوگوں کے ذہن سے بھی آج خارج ہو چکی ہے۔ وہ بات ہے: نَهْيٌ عَنِ الْمُنْكَرِ۔ بدی سے روکنا ـــــ ہم نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ بس بھلائی کی تلقین سے کام چل جائے گا۔ صرف نیکی کا وعظ کہنے سے بات بن جائے گی۔ حالانکہ یہ بات اچھی طرح جان لیجئے کہ میں قرآن مجید کے کم سے کم نو ایسے مقامات کا حوالہ دے سکتا ہوں۔ جہاں گاڑی کے دو پہیوں کی طرح یہ دونوں اصطلاحات بالکل ساتھ ساتھ اور جوڑے کی شکل میں آئی ہیں۔ وَاْمُرْ بِالْمَعْرُوْفِ وَانْهَ عَنِ الْمُنْكَرِ، نیکی کا حکم دیا کرو اور بدی سے روکو ـــــ بدی سے روکنا کتنا اہم ہے اس کو ان دو دو حدیثوں سے سمجھئے جو میں نے آغاز میں آپ کو سنائی تھیں۔ میں وقت کی کمی کے باعث صرف مختصر تشریح پر اکتفا کروں گا ـــــ میں نے آپ کو جو حدیثیں سنائی تھیں یہ دونوں مسلم شریف کی روایات ہیں 'صحیح مسلم' کا کتب احادیث میں کیا مقام ہے! اسے بیان کرنے کی میں ضرورت محسوس نہیں کرتا مجھے یقین ہے کہ اس اجتماع میں جو لوگ شریک ہیں وہ 'صحیح مسلم' کے مقام و مرتبہ سے بخوبی واقف ہوں گے۔ ایک حدیث کے راوی ہیں حضرت ابوسعید الخدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ مجھے توقع ہے کہ یہ حدیث آپ میں سے اکثر نے سنی ہوگی۔ لہٰذا اس کا تو صرف متن کے ساتھ ترجمہ کروں گا لیکن دوسری حدیث اس قدر زیادہ عام نہیں ہے۔ حالانکہ اس کے راوی ہیں حضرت عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ۔ ہماری جو فقہ حنفی ہے وہ دراصل فقہ عبداللہ بن مسعود ہے، اس لئے کہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ دو واسطوں سے حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ کے شاگرد ہیں۔ لہٰذا درحقیقت انہی کی فقہی آراء ہیں کہ جنہوں نے فقہ حنفی کی شکل اختیار کی۔

پہلی حدیث جس کے راوی ہیں حضرت ابوسعید الخدریؓ۔ وہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مَنْ رَاٰى مِنْكُمْ مُنْكَرًا فَلْيُغَيِّرْهُ بِيَدِهٖ "جو کوئی تم میں سے برائی کو دیکھے تو اس پر لازم ہے کہ اسے اپنے ہاتھ سے روکے یعنی طاقت سے اسے بدل ڈالیں"۔ وَاِنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ فَبِلِسَانِهٖ "لیکن اگر وہ اس کی استطاعت نہ رکھتا ہو، اس کے ہاتھ میں قوت و طاقت نافذہ نہ ہو تو اسے زبان سے روکے، اس کی مذمت کرے، اس پر تنقید کرے" زبان سے اسے بدلنے کی کوشش کرے" ـــــ وان لم یستطع فبقلبہٖ "اگر اس کی استطاعت بھی نہ رکھتا ہو، زبانوں پر بھی قدغنیں لگا دی گئی ہوں، زبان پر بھی پہرے ہوں تو 'فبقلبہٖ'، کم سے کم دل میں ایک گھٹن محسوس کرے، قلب میں ایک کرب، صدمہ اور رنج کی کیفیت تو ہو" حضور صلی اللہ علیہ نے اس آخری کیفیت کے بارے میں فرمایا: وَذٰلِكَ اَضْعَفُ الْاِيْمَانِ۔ "یہ ایمان کا کمزور ترین درجہ ہے" ـــــ اب میں آپ سے اس حدیث پر غور کرنے کی درخواست کرتا ہوں۔ دیکھئے اس میں پہلی اہم بات تو یہ ہے کہ اس میں 'امر بالمعروف' کا ذکر موجود ہی نہیں ہے۔

سارا زور نہی عن المنکر پر ہے ۔ ایک اسلامی نظامِ حکومت کا فرض ہے کہ قوت وطاقت کے ساتھ منکرات کو روک دے لیکن اگر اسلامی نظامِ حکومت قائم نہیں ہے اور منکرات کو فروغ ہو رہا ہے تو بندۂ مومن پر واجب ہے کہ وہ ڈنکے کی چوٹ حق کی بات کہے، منکرات کے خلاف تنقید کرے، زبان وقلم سے ان منکرات کو بدلنے کی سعی کرے۔ لیکن ایک شخص کمزور ہے، وہ یہ سمجھتا ہے کہ اگر میں نے منکرات کے خلاف آواز اٹھائی، زبان کھولی تو اوّل تو معاشرہ ہی میں میرا استہزا کرے گا، مذاق اڑے گا پھر ہو سکتا ہے کہ حکومت وقت مجھے اس پر قید کر کے جیل میں ٹھونس دے۔ لہٰذا وہ زبان سے کچھ کہنے کی ہمت نہیں پاتا۔ لیکن وہ ان منکرات کے خلاف دل میں چبھن اور گھٹن محسوس کرتا ہے، ان منکرات پر کڑھتا ہے۔ تب بھی حضورؐ کے ارشاد کے بموجب اس کے دل میں ایمان ہے تو سہی ہے لیکن کمزور ترین ایمان ہے۔ "اَضْعَفُ" افضل التفضیل کا صیغہ ہے یعنی ایمان کی کمزوری اپنی آخری حدود کو چھو رہی ہے۔ چنانچہ اسی حدیث کی دوسری روایت کے آخری حصہ میں " وَذٰلِکَ اَضْعَفُ الْاِیْمَانُ " کے بجائے یہ الفاظ آئے ہیں کہ :
" وَلَیْسَ وَرَآءَ ذٰلِکَ مِنَ الْاِیْمَانِ حَبَّۃُ خَرْدَلٍ " یعنی اگر ان تین حالتوں میں سے کوئی بھی نہیں ہے تو ایسا شخص جان لے کہ اس کے دل میں رائی کے برابر بھی ایمان موجود نہیں ہے ـــــ البتہ یہ تینوں کیفیتیں ایسی نہیں ہیں کہ جن کے لئے خارج میں آپ کوئی ضابطہ بنا سکیں بلکہ اس کا سارا معاملہ انسان کے اپنے ایمان ویقین پر ہے۔ اس کے اندر کتنا یقین (Conviction) ہے۔ اس کے اندر دین کے لئے کتنی غیرت ہے! کتنی حمیّت ہے! اس کا دار ومدار اس پر ہے۔ میں کہا کرتا ہوں کہ کوئی شخص ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ اسے ماں کی گالی دی جائے اور وہ چپ کھڑا رہے۔ اس کا یہ طرزِ عمل غمازی کرتا ہے کہ نہ صرف یہ کہ اس کے اندر جرأت وہمت نہیں ہے بلکہ غیرت وحمیت کا بھی فقدان ہے ـــــ لیکن کوئی شخص ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ اسے ماں کی گالی دی جائے تو اگر اس میں ہمت نہیں ہے۔ مگر غیرت وحمیت موجود ہے تو یہ لازماً یہ ہو کر رہے گا کہ اس کے جسم کا سارا خون اس کے چہرے پر آجائے گا۔ وہ کچھ اور نہیں کر سکے گا تو اپنی جگہ کھڑا ہوا کانپنے لگے گا اور لرزے گا اور دل ہی دل میں انتہائی کرب، صدمہ اور رنج محسوس کرے گا۔ غیرت وحمیت کا کم سے کم تقاضا یہ تو ہر ایک تسلیم کرے گا کہ اس کا چہرہ سرخ ہو جائے، وہ تھرتھرائے اور دل میں کرب واضطراب محسوس کرے اور اگر اس میں کوئی دم بھی ہے طاقت بھی ہے تو وہ اس شخص کو جانے نہیں دے گا جس نے اسے ماں کی گالی دی ہے ـــــ

اس مثال سے اس بات کو سمجھئے کہ جن میں اللہ کے دین کی زیادہ غیرت وحمیت ہوگی، وہ اپنے کمزوری کے باوجود ڈٹ جائیں گے۔ زیادہ سے زیادہ یہی ہوگا کہ جیلوں میں ٹھونس دیئے جائیں گے۔

یا پھر یہ کہ لاٹھیوں اور گولیوں کی بوچھاڑ سہنی پڑے گی۔ یا آخری درجہ میں ہدیۂ جان کا نذرانہ دینا پڑیگا۔ اس زندگی کا اس سے بہتر مصرف اور کیا ہو سکتا ہے کہ اسے اللہ کی راہ میں کھپا دیا جائے ؎

جان دی دی ہوئی اسی کی تھی! حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا!

حدیث کا آخری ٹکڑا " وَ ذٰلِكَ اَضْعَفُ الْاِیْمَانِ " یہ بتا رہا ہے کہ اصل مطلوب اور غیرت و حمیت دینی کا تقاضا یہ ہے کہ بدی کے خلاف طاقت فراہم کی جائے اور اس کا استیصال کیا جائے۔

اب دوسری حدیث کی طرف آئیے۔ یہاں اس بات کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اور زیادہ نکھار کر بیان کیا ہے۔ جیسا کہ میں بتا چکا ہوں کہ اس کے راوی ہیں حضرت عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ ـــــ وہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مَا مِنْ نَبِیٍّ بَعَثَهُ اللّٰهُ فِیْ اُمَّةٍ قَبْلِیْ ـــ "مجھ سے پہلے اللہ نے جس امت میں کسی نبی کو مبعوث فرمایا" اِلَّا كَانَ لَهٗ فِیْ اُمَّتِهٖ حَوَارِیُّوْنَ وَ اَصْحَابٌ " تو اس کی امت میں اس کے حواری اور اصحاب ہوئے تھے" ـــ حواری کا لفظ خاص طور پر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ساتھیوں کے لئے آتا ہے جیسے :- قَالَ الْحَوَارِیُّوْنَ نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰهِ ـــ اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھیوں کے لئے صحابی یا اصحاب کا لفظ آتا ہے ـــ حضورؐ نے یہاں دونوں الفاظ یعنی حواریون اور اصحاب کو جمع کر لیا ـــ وہ کیا کرتے تھے: یَاْخُذُوْنَ بِسُنَّتِهٖ وَ یَقْتَدُوْنَ بِاَمْرِهٖ " وہ اپنے نبی کی سنّت کو مضبوطی سے تھامے رکھتے تھے اور نبیؐ کا جو بھی حکم ہوتا تھا اس کی پیروی کرتے تھے" ـــ ثُمَّ اِنَّهَا تَخْلُفُ مِنْ بَعْدِهِمْ خُلُوْفٌ ـــ "پھر ان کے بعد ان کے ایسے جانشین آئے تھے جو نالائق و ناخلف ہوتے تھے ـــ گویا ایک دو تین نسل تک تو معاملہ بڑی حد تک ٹھیک ٹھاک چلتا تھا۔ میں نے ایک دو نسل کیوں کہا! یہ بھی حضورؐ کی ایک حدیث میں آیا ہے: خَیْرُ اُمَّتِیْ قَرْنِیْ ثُمَّ الَّذِیْنَ یَلُوْنَهُمْ ثُمَّ الَّذِیْنَ یَلُوْنَهُمْ " میری امت کا بہترین دور میرا دور ہے پھر ان لوگوں کا جو میرے اصحابؓ سے ملیں گے پھر ان لوگوں کا جو میرے اصحابؓ سے ملنے والوں سے ملیں گے۔" ان ادوار کو ہم " قُرُوْنٌ مَشْهُوْدٌ لَهَا بِالْخَیْرِ " کہتے ہیں۔ گویا حضورؐ اور صحابہ کرامؓ کا زمانہ بہترین ہے۔ پھر دوسرے نمبر پر تابعین کا زمانہ ہے اور اس کے بعد درجہ ہے تبع تابعین کے عہد کا! ـــ اب پھر حدیث زیر بحث کی طرف رجوع کیجئے فرمایا: ثُمَّ اِنَّهَا تَخْلُفُ مِنْ بَعْدِهِمْ خُلُوْفٌ. ایک ایک لفظ پر غور کیجئے ـــ حضورؐ نے فرمایا " ان کے بعد ان کے ایسے جانشین آجاتے تھے جو ناخلف اور نالائق ہوتے تھے" یَقُوْلُوْنَ مَا لَا یَفْعَلُوْنَ " وہ کہتے تھے جو کچھ کرتے نہیں تھے"

ـــ وَيَفْعَلُوْنَ مَالَا يُؤْمَرُوْنَ ۔ "اور کرتے وہ کام تھے جن کا انہیں حکم نہیں ہوا تھا" ـــ یہاں اشارہ بدعات کی طرف ہے! دین میں نئی نئی چیزیں ایجاد کر لی گئی ہیں۔ نئے نئے طریقے اختراع کر لئے گئے ہیں ـــ یہ اصول پیش نظر رکھئے کہ جو بدعت بھی آئے گی وہ کسی نہ کسی سنّت کو ہٹا کر اس کی جگہ لے گی ۔ یہ ممکن ہی نہیں ہے کہ بدعت آئے اور سنّت رخصت نہ ہو ـــ ان ناخلف اور نالائق جانشینوں کے متعلق حضورؐ نے بڑا خوبصورت اور جامع پیرایہ بیان اختیار فرمایا : یَقُوْلُوْنَ مَا یفعلون ویفعلون مالا یومرون ـــ آگے بڑھنے سے قبل پہلے تو یہ غور کیجئے کہ ہم کس دور میں ہیں! آیا ہم اس دور میں بس رہے ہیں جس کا ذکر پہلے کیا گیا یا اس میں جس کا ذکر بعد میں کیا گیا ہے۔ اب تو پندرھویں صدی شروع ہو چکی ہے ـــ میں تو کہا کرتا ہوں کہ دورِ صحابہؓ کے بعد چوتھی ہی نسل سے بالکل ابتدائی درجے میں وہ بات شروع ہو چکی تھی۔ جس کے متعلق مشہور تبع تابعی، محدّث اور اپنے دور کے عالم باعمل اور مجاہد حضرت عبداللہ ابن مبارک رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے اس شعر میں رہنمائی کی ہے ـــ

وَمَا اَفْسَدَ الدِّیْنَ اِلَّا الْمُلُوْكُ وَاَحْبَارُ سُوْءٍ وَرُهْبَانُهَا

یعنی دین میں جو خرابی بھی آتی ہے وہ تین اطراف سے آتی ہے ۔ بادشاہوں کی طرف سے ۔ علماءِ سو یعنی بُرے علماء کی طرف سے اور بُرے صوفیوں کی طرف سے ! ایک تو علماء حقّانی ہیں جو واقعی اللہ کے دین کو عام کرتے ہیں، اس پر خود بھی چلتے ہیں اور لوگوں کو بھی چلاتے ہیں ـــ ایک وہ اللہ والے صوفیاء ہیں جو اللہ ہی کے راستہ پر چلنے اور چلانے والے ہیں ۔ لیکن اس بازار میں تو ہر طرح کے لوگ موجود ہیں ۔ جہاں علماء حقّانی ہیں وہاں علماء سو بھی ہیں ۔ جہاں دین و شریعت پر عامل صوفیاء ہیں وہاں دنیا دار اور ظاہر دار صوفی بھی ہیں ـــ حضرت عبداللہ ابن مبارکؒ کی تشخیص کے مطابق دین میں خرابی ان تین اطراف سے آتی ہے اور انہوں نے ان خرابیوں کا بنفسِ نفیس کسی قدر مشاہدہ کیا ہوگا جب ہی تو یہ تشخیص کی تھی ۔ تو آپ اندازہ کیجئے کہ پندرھویں صدی میں ہم بیٹھے ہیں تو خرابیوں کے اعتبار سے ہم کس مقام پر ہیں! ـــ آگے نبی اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم فرماتے ہیں : فَمَنْ جَاهَدَهُمْ بِيَدِهٖ فَهُوَ مُؤْمِنٌ ۔ "جو کوئی ایسے ناخلف لوگوں سے جہاد کرے گا اپنے ہاتھ سے، پس وہ مومن ہے"۔ وَمَنْ جَاهَدَهُمْ بِلِسَانِهٖ فَهُوَ مُؤْمِنٌ "اور جو ایسے لوگوں سے جہاد کرے گا اپنی زبان سے پس وہ مومن ہے"۔ وَمَنْ جَاهَدَهُمْ بِقَلْبِهٖ فَهُوَ مُؤْمِنٌ۔ "اور جو ایسے نالائقوں کے خلاف اپنے دل سے جہاد کرے ۔ ان کے افعال پر اپنے دل میں کرب اور

صدمہ محسوس کرے، مضطرب اور بےچین رہے پس وہ (بھی) مومن ہے" ـــــ اور آخر میں حضورؐ نے فرمایا: وَلَيْسَ وَرَاءَ ذٰلِكَ مِنَ الْاِيْمَانِ حَبَّةُ خَرْدَلٍ ـ" اور اس کے بعد تو ایمان رائی کے دانہ کے برابر بھی نہیں ہے" حضورؐ کے اس ارشاد کے آخری حصّہ پر غور کیجئے! یہ لرزہ طاری کر دینے والی وعید ہے ـ اگر ان تین حالتوں میں سے کوئی بھی موجود نہیں ہے ـ تو الصّادق والمصدوق، شافع محشر صلّی اللہ علیہ وسلّم ایسے شخص کے ایمان کی نفی فرما رہے ہیں ـــ یہ واضح ہے کہ یہاں حقیقی ایمان کی نفی مراد ہے ـ قانونی طور پر نفی نہیں ہے اور دل دل کا معاملہ ہے ـ ظاہر بات ہے کہ دل اور نیت کے معاملات کے متعلق اس دنیا میں کوئی حکم نہیں لگایا جاسکتا ـ یہ فیصلہ تو اُخروی عدالت میں ہوگا جس کے متعلق سورہ تغابن میں فرمایا: ذٰلِكَ يَوْمُ التَّغَابُنِ ـ "آخرت کا دن ہے۔ اصل بارجیت کے فیصلہ کا دن" ـــــ اس پہلی حدیث کے آخری حصّہ کے متعلق میں عرض کر چکا ہوں جو حضرت سعید الخدریؓ سے روایت ہے کہ اس میں دوسرے طُرق کی روایت کے آخر میں وَذٰلِكَ اَضْعَفُ الْاِيْمَانِ کی جگہ یہی الفاظ آئے ہیں: وَلَيْسَ وَرَاءَ ذٰلِكَ مِنَ الْاِيْمَانِ حَبَّةُ خَرْدَلٍ ـــ

اس حدیث شریف کے ایک اہم نکتہ کی جانب توجہ کیجئے! ـ اس حدیث میں 'هُمْ' کی ضمیر مفعولی انتہائی قابلِ غور ہے۔ نبی اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم ان ناخلف جانشینوں کے خلاف جہاد کی تاکید فرما رہے ہیں جو مسندِ اقتدار پر بیٹھ کر منکرات کو فروغ دے رہے ہوں، جن کے طور طریقے منکرات پر مشتمل ہوں۔ جو ذرائع ابلاغ کو منکرات کی تشہیر و اشاعت کے لئے استعمال کر رہے ہوں، جو ملک بھر میں ایسے تمام اداروں کی داغے، درمے، سخنے سرپرستی کر رہے ہوں جو منکرات کے فروغ میں دن رات مصروف ہیں جن کی مساعی کی بدولت معروفات معاشرہ میں مسک رہی ہوں اور وہ سنڈاس بن گیا ہو ـــــ ساتھ ہی ان علماء سو کے اور ان نام نہاد صوفیاء کے خلاف بھی جہاد کی تاکید اس حدیث میں تبعًا موجود ہے جو مسندِ اقتدار و ارشاد پر بیٹھے ان منکرات کو دیکھ رہے ہوں اور ان منکرات کے خلاف مہر بہ لب ہی نہ ہوں بلکہ اقتدارِ وقت کے اعوان و معین بنے ہوئے ہوں۔

(جاری ہے)

قرآنِ مجید کی اخلاقی اور قانونی تعلیمات

ازقلم: مولانا محمد طاسین

الحمد للہ رب العالمین ۔ والصلاۃ والسلام علی سید الانبیاء والمرسلین ۔ محمد وعلی آلہ واصحابہ اجمعین ۔ اما بعد فقد قال اللہ عزوجل فی کتابہ المبین: ان اللہ یأمر بالعدل والاحسان وایتاء ذی القربی وینھی عن الفحشاء والمنکر والبغی ۔ یعظکم لعلکم تذکرون ۔ صدق اللہ العلی العظیم۔

میرے مقالے کا موضوع ہے: "قرآن مجید کی اخلاقی اور قانونی تعلیمات"۔ اور مقصد، قرآن مجید کی اخلاقی اور قانونی تعلیمات کا مختصر تعارف پیش کرنا اور کچھ ان خصوصیات اور مزایا پر روشنی ڈالنا ہے۔ جو ان دو قسم کی قرآنی تعلیمات کو ایک دوسرے سے جدا اور ممیز کرتی نہیں، لیکن چونکہ گفتگو کا محور اور مدار، قرآن مجید ہے۔ لہٰذا مناسب سمجھتا ہوں کہ اصل مقصد سے پہلے کچھ خود قرآن مجید کے بارے میں بھی عرض کر دیا جائے۔

ہمارے اعتقاد کے مطابق، قرآن مجید، صحفِ سماویہ میں سے آخری صحیفہ اور کتبِ الٰہیہ میں سے اختتامی کتاب ہے جس کا نزول، آخری نبی و رسول حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم پر ہوا جب وحی و رسالت کا مقدس سلسلہ اپنے انتہائی درجۂ کمال کو پہنچا، اور یہ کہ قرآن مجید رشد و ہدایت کے لحاظ سے ایک نہایت جامع اور مکمل کتاب، حقائق و معارف کا بحرِ ناپیدا کنار، بصائر و عبر کا گنج گراں مایہ، اور معنوی و صوری محاسن کے اعتبار سے نبی آخر الزمان کا ایک دائمی معجزہ اور آپ کی صداقت پر روشن اور لاجواب دلیل ہے، اور یہ کہ سابقہ کتب سماویہ میں جو ہدایات و تعلیمات منفرق طور پر دی گئی تھیں وہ قرآن مجید میں اپنی صحیح ترین، کامل ترین، جامع ترین اور احسن ترین صورت میں موجود اور جلوہ گر ہیں اور قرآن حکیم اپنے سے پہلے نازل شدہ کتابوں کا مصدّق اور مہیمن ہے، اور چونکہ اس کی حفاظت کا ذمہ خود اللہ تعالیٰ نے لیا ہے لہٰذا بغیر کسی تغیر و تبدل اور ترمیم و تنسیخ کے اس کا اپنی حقیقی صورت میں محفوظ اور تاقیامت قائم رہنا، اس کی وہ امتیازی خصوصیت ہے جو اس سے پہلے کی کسی الہامی کتاب کو نصیب نہیں ہوئی۔ پھر جب ہم یہ کہتے ہیں کہ قرآن حکیم رشد و ہدایت کے لحاظ سے ایک کامل نظام زندگی اور

جامع دستورِ حیات ہے تو اس کا کبھی یہ مطلب نہیں ہوتا کہ اس کے اندر حیاتِ انسانی کے تمام جزوی مسائل کے لیے تفصیلی احکام موجود و مذکور ہیں کیونکہ یہ مطلب بداہتہً غلط ہے، بلکہ اس کا مطلب یہ ہوتا اور یہی ہو سکتا بھی ہے کہ اس کے اندر حیاتِ انسانی کے ہر شعبہ سے متعلق ایسے بنیادی اصول و تصورات تمام و کمال موجود ہیں جن میں تمام جزوی مسائل کے لیے کلی و اجمالی ہدایت و راہنمائی پائی جاتی ہے۔ اور اُن کی روشنی میں عقل و فکر رکھنے والے ہر جزوی مسئلہ کا اسلامی حل اور شرعی حکم بخوبی معلوم و متعین کر سکتے ہیں۔

اسی طرح قرآن مجید کے اصول و تصورات کے مجموعے کو لفظ نظام سے تعبیر کرنے کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ وہ بے ربط قسم کے منتشر اور بکھرے خیالات نہیں بلکہ عقلی ترتیب کے ساتھ باہم گرمربوط منظم، اور سب کے سب بلا واسطہ اور بالواسطہ طور پر ایک متعین مقصد سے اس طرح ہم آہنگ وابستہ ہیں جس طرح کسی کل کے تمام اجزاء، کل کے مقصدِ وجود سے وابستہ اور ہم آہنگ ہوتے ہیں۔

قرآن مجید میں جتنی بھی ہدایات و تعلیمات ہیں وہ تمام تر بندوں کے فائدہ کے لیے ہیں اُن سے مقصود انسانوں کی ہمہ جہتی فوز و فلاح ہے دنیوی بھی اور اُخروی بھی، مادی بھی اور روحانی بھی، انفرادی بھی اور اجتماعی بھی، جہاں تک اُخروی فوز و فلاح کا تعلق ہے۔ قرآن مجید کے اپنے بیان کے مطابق اُس کا مطلب ہے۔ عذابِ جہنم سے دُوری اور جنت کی سکونت اور حضوری، یعنی خوف و حزن سے پاک، ابدی اور لازوال امن و اطمینان کی زندگی جس میں ہر خواہش کے پُورے ہونے کی مکمل ضمانت اور اُس کی تسکین کا پُورا سامان ہو "لَهُمْ فِيهَا مَا يَشَاءُونَ وَلَهُمْ مَا يَشْتَهُونَ" جنت میں جنتیوں کے لیے وہ سب کچھ ہوگا جو وہ چاہیں گے اور جس کی اُن کے اندر اشتہاء اور خواہش پیدا ہوگی۔ اور انسان کی دنیوی فوز و فلاح کا مطلب ہے: خوف و حزن سے خالی پائدار امن و اطمینان کی وہ خوشگوار زندگی نصیب ہونا جو اسباب کے ذریعے تمام فطری تقاضوں کی تکمیل اور تسکین سے وجود میں آتی ہے۔ اور جس کی طلب و خواہش ہر انسان کے اندر فطری اور پیدائشی طور پر پائی جاتی ہے۔ نیز جس میں انسان کی خلاقی و تخلیقی صلاحیتوں کو اُبھرنے اور بروئے کار آنے کا موقع ملتا ہے۔ جو اشیائے کائنات میں تصرف کرنے اور ان سے فائدہ اٹھانے کی غرض سے اُسے ودیعت کی گئی ہیں۔

قرآنِ حکیم انسان کی دنیوی فلاح و کامیابی کے لیے ایک ایسے معاشرے کا قیام ضروری قرار دیتا ہے جس میں عدل اور احسان کا دَور دورہ ہو، یعنی جس میں نہ صرف یہ کہ بلا کسی تخصیص و امتیاز ہر ہر فرد کے ہر قسم کے حقوق ٹھیک ٹھیک اور پُورے پُورے محفوظ ہوں اور کسی کی کوئی حق تلفی نہ ہو

رہی ہو بلکہ افراد اپنے حقوق کا ایک دوسرے کے لیے ایثار کرتے اور فیاضی کے ساتھ ایک دوسرے سے پیش آتے ہوں، اور غالباً یہ اس لیے ضروری قرار دیتا ہے کہ اگر اس دنیا میں کسی فرد کو پائدار امن و اطمینان کی وہ خوشگوار اور ترقی بدوش زندگی مل سکتی ہے جسے قرآن مجید نے حیاتِ طیبہ، حیاتِ حسنہ، عیشۂ راضیہ اور بشریٰ وغیرہ سے تعبیر فرمایا اور ایمان کے ساتھ عملِ صالح کرنے والوں کو یقین دلایا ہے کہ انہیں بطور جزاء، آخرت کی جنت سے پہلے، اس دنیا میں بھی ہم حیات طیبہ اور حسنہ سے نوازیں گے، تو ایسی زندگی ایک فرد کو صرف ایسے ہی انسانی معاشرے میں مل سکتی ہے جس میں عدل اور احسان کی کارفرمائی اور علمداری ہو، کیونکہ یہ ایک امر واقعہ اور ناقابل انکار تاریخی حقیقت ہے کہ جس معاشرے میں ظلم و حق تلفی ہو اور افراد کے حقوق پوری طرح محفوظ نہ ہوں اس میں دیر سویر ایسے حالات ضرور رونما ہو کر رہتے ہیں۔ جو پورے معاشرے کو بدامنی و بے چینی میں مبتلا کر کے رکھ دیتے ہیں اور ظالم و مظلوم دونوں کو تباہی و بربادی سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔

قرآن مجید کے متعلق یہ چند اصولی باتیں عرض کرنے کے بعد، اب میں، پہلے قرآنی تعلیمات کا ایک عمومی اور اجمالی تعارف اور پھر اس کی اخلاقی اور قانونی تعلیمات کا، خصوصی اور تفصیلی تعارف پیش کرنا چاہتا ہوں،

قرآن مجید کے مطالعے سے واضح ہوتا ہے کہ اس کے اندر انسانی فوز و فلاح اور بشریٰ نجات و سعادت کے متعلق جو ہدایات و تعلیمات ہیں اُن کا ایک بڑا حصہ ایمانی عقائد سے تعلق رکھتا ہے، ایمانی عقائد سے مراد ہیں: اللہ کی ذات و صفات کا عقیدہ، اللہ کے ملائکہ اور فرشتوں کا عقیدہ، اللہ کی آسمانی کتابوں کا عقیدہ، اللہ کے نبیوں اور رسولوں کا عقیدہ، حیات بعد الممات، حشر و نشر، قیامت اور اُخروی حساب و کتاب اور جزاء و سزا کا عقیدہ۔ ان عقائد میں سب سے بنیادی اور اساسی عقیدہ اللہ کی ذات و صفات اور توحید کا عقیدہ ہے جو تمام اسلامی تعلیمات کے لیے خشتِ اوّل اور سنگِ بنیاد کی حیثیت رکھتا ہے باقی عقائد اسی پر مبنی اور اسی کے فروع اور لوازم ہیں ان عقائد کا چونکہ ماوراء محسوسات اور مابعد الطبیعات حقیقتوں سے تعلق ہے لہٰذا ایمانی عقائد سے متعلق ان تعلیماتِ قرآنی کو مابعد الطبیعاتی تعلیمات سے تعبیر کیا جاسکتا ہے، دراصل یہی وہ تعلیمات ہیں جو علم الکلام کا موضوع بنیں اور طول طویل اور دور از کار متکلمانہ مباحث نے ان کو بُری طرح اُلجھا کر رکھ دیا، بہر حال میں یہاں مناسب سمجھتا ہوں کہ ان اعتقادی تعلیمات کے افادی پہلو کی بھی کچھ وضاحت عرض کی جائے۔

قرآن حکیم انسانی فوز و فلاح کی خاطر، جس قسم کا مثالی انسانی معاشرہ تجویز کرتا اور اس کے قیام پر زور دیتا ہے اس کے دو پہلو ہیں، ایک ذہنی و فکری اور دوسرا خارجی و عملی، ذہنی و فکری پہلو کے وجود میں آنے کا دار و مدار قرآن مجید کی انہی اعتقادی اور ایمانی تعلیمات پر ہے، دراصل ان ہی اعتقادی اور ایمانی تعلیمات سے وہ خاص طرح کا ذہنی و فکری ماحول تیار ہوتا ہے جو قرآن مجید کی عملی تعلیمات کے عمل میں آنے اور پائداری کے ساتھ قائم رہنے کے لیے ضروری و ناگزیر ہے۔ مطلب یہ کہ جس معاشرے میں وہ خاص طرح کا ذہنی ماحول موجود نہ ہو اس کے اندر اسلام کی عملی تعلیمات پر پہلے تو پوری طرح عمل میں نہیں ہو سکتا اور اگر کسی طور عمل ہو جائے تو پائداری کے ساتھ قائم نہیں رہ سکتا، مثلاً اسلام کی ان عملی تعلیمات کو لیجئے جو باہمی معاملات سے تعلق رکھتی اور جن کا یہ تقاضا ہے کہ دنیا کے ہر انسان کے ساتھ یکساں عدل و انصاف کیا جائے، ظاہر ہے کہ ان تعلیمات پر پوری طرح اور صحیح طریقہ سے وہی انسان عمل کر سکتا ہے جس کے ذہن میں عدل و انصاف کا نہایت وسیع اور عالمگیر جذبہ ہو یعنی جس کا دائرہ خاص رنگ، نسل، وطن، زبان سے تعلق رکھنے والے انسانوں اور مخصوص قوم، قبیلے اور خاندان کے افراد تک محدود نہ ہو بلکہ بلا کسی تخصیص و امتیاز پوری انسانیت تک وسیع اور ممتد ہو، جبکہ وہ انسان ایسی تعلیمات پر ٹھیک طریقہ سے عمل نہیں کر سکتا جس کے اندر جذبہ عدل تو ہو لیکن خاص رنگ و نسل، وطن و قوم اور قبیلے و خاندان سے تعلق رکھنے والے افراد تک محدود ہو، اور یہ حقیقت ہے کہ جذبۂ عدل میں عالمگیر وسعت صرف اللہ رب العلمین کے عقیدہ سے پیدا ہو سکتی ہے دوسرے کسی عقیدہ سے پیدا نہیں ہو سکتی، یہاں یہ واضح کر دینا ضروری ہے کہ جہاں تک مطلق جذبہ عدل کا تعلق ہے ہر انسان کے اندر پیدائشی طور پر موجود ہوتا ہے تعلیم و تربیت سے صرف اس کی شکل کی تعین و تحدید ہوتی ہے، ٹھیک یہی حال جذبہ احسان و ہمدردی کا بھی ہے ایمانی عقائد کی تعلیم سے وہ پیدا نہیں ہوتا بلکہ اللہ رحمان و رحیم اور غفور و حلیم کے عقیدہ سے اس میں عالمگیر وسعت پیدا ہوتی اور وہ بلا تخصیص و امتیاز تمام انسانوں تک پھیل جاتا لہٰذا جس انسان کے اندر احسان و فیاضی کا وسیع و عالمگیر جذبہ ہو وہ اسلام کی ان عملی تعلیمات پر بآسانی اور بخوبی عمل کر سکتا ہے جو بر و احسان پر مبنی اور ایثار کا تقاضا کرتی ہیں، اسی طرح اسلام کی ان عملی تعلیمات پر جو عبادات سے تعلق رکھتی ہیں۔ وہ شخص خوشی و دلجمعی کے ساتھ عمل کر سکتا ہے جس کے دل میں اللہ کی ذات و صفات اور آخرت کی جزا و سزا کا اعتقاد و یقین ہو اور وہ ان پر سچا ایمان رکھتا ہو، غرضیکہ ایمانی عقائد کی تعلیم سے ایک ایسا ذہنی پس منظر تیار ہوتا اور ایسا اخلاقی ماحول وجود میں آتا ہے جو اسلام کے عملی نظام کے لیے بنیاد کی حیثیت رکھتا ہے۔

اعتقادی و ایمانی تعلیمات کا ایک بڑا فائدہ یہ کہ اِن سے انسان کو اُن بُنیادی سوالات کے جوابات مل جاتے ہیں جو کائنات کے آغاز و انجام، انسان کے مبدأ و معاد، کائنات میں انسان کی حیثیت و پوزیشن، خیر و شر اور نیکی و بدی کی حقیقت کے بارے میں انسانی عقل و ذہن میں پیدا ہوتے اور جواب نہ ملنے پر اُسے مضطرب و بے چین رکھتے ہیں۔

اسی طرح ایمانی عقائد سے انسانوں کو نبی و رسُول کی صُورت میں خیر و نیکی اور صلاح و تقوے کا ایک کامل نمونہ اور مثالی پیکر ملتا ہے جس سے انہیں عملی زندگی میں نیکی و تقوے اور عدل و احسان کے عملی مطالب کو جاننے میں مدد ملتی اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ سیرت و کردار کے لحاظ سے ایک کامل و بہترین انسان کی عملی تصویر کیا ہے۔

قرآنی تعلیمات کا ایک دوسرا بڑا حصہ دینی عبادات سے تعلق رکھتا ہے، تعلیمات کے اس حصہ سے مُراد وہ تعلیمات ہیں جو صلوٰۃ، زکوٰۃ، روزے، حج و عمرے، صدقہ و قربانی اور تبلیغ و جہاد وغیرہ سے تعلق رکھتی ہیں یہ تعلیمات دراصل اُس تعلیم پر مبنی ہیں جو اللہ کی ذات و صفات سے متعلق قرآن مجید میں مذکور ہے کیونکہ جہاں اللہ کی ذات و صفات کے متعلق اعتقاد و ایمان موجود نہ ہو وہاں اللہ کی کسی عبادت کا خیال ہی پیدا نہیں ہوتا، پھر غور سے دیکھا جائے تو اِن عبادات کا بھی اُس مثالی معاشرے کی تشکیل سے گہرا اور مضبوط تعلق ہے جو اسلام بروئے کار لانا چاہتا ہے اور جس کے کچھ خدوخال کا پہلے ذکر کیا گیا، اُس عادلانہ معاشرے کی تشکیل میں عبادات کا جو رول اور کردار ہے وہ یہ کہ عبادات کے ذریعے ایک طرف ذہنوں میں ایمانی عقائد اور ان سے تشکیل شُدہ احساسات نیکی و تقویٰ اور جذبات عدل و احسان، زندہ، بیدار، تازہ اور اُجاگر رہتے ہیں جن کی تحریک سے اعمالِ صالحہ کا صدور ہوتا ہے۔ اور دوسری طرف ان عبادات پر عمل درآمد سے نفس انسانی کی اصلاح و تربیت ہوتی لہٰذا بندۂ مومن اُن احکام کی تعمیل اور پابندی میں زیادہ دقت محسوس نہیں کرتا جو اجتماعی زندگی کے مختلف پہلوؤں کے متعلق قرآن مجید نے تجویز کیے ہیں بلکہ اس کے لیے ان پر عمل کرنا آسان ہو جاتا ہے، بشرطیکہ وہ عبادات صحیح ایمانی عقیدہ کے ساتھ سوچ سمجھ کر محض اللہ کی رضا و خوشنودی کی خاطر ادا کی جائیں، مطلب یہ کہ جو عبادات اللہ کے متعلق شرک آمیز عقیدے، ریاکاری اور بے سوچے سمجھے محض عادت اور رسم کے طور پر ادا کی جاتی ہیں ان سے مذکورہ فوائد حاصل نہیں ہو سکتے، نہ اس قسم کی عبادات، عبادت کرنے والے کو برائیوں سے روکتی اور نہ نیکیوں اور اچھائیوں پر اُبھارتی ہیں اور نہ اُن کے ذریعے وہ سازگار ذہنی فضا تیار ہوتی ہے جو اسلام کے عملی نظام کے نفاذ اور عمل میں آنے کے لیے ضروری

اور ناگزیر ہے۔

ان دو قسم کی تعلیمات کے ساتھ قرآنی تعلیمات کا ایک بڑا حصہ وہ ہے جو اجتماعی زندگی کے مختلف امور و معاملات سے تعلق رکھتا اور جن پر عمل کرنے سے ایک ہر لحاظ سے معتدل و متوازن معاشرہ وجود میں آتا ہے جس کے اندر ہر ہر فرد کے لیے پائدار امن و اطمینان کی ضمانت ہوتی ہے۔ اس تیسری قسم کی تعلیمات میں سے بعض معاشرتی نوعیت کی ہیں جن میں سرفہرست وہ تعلیمات آتی ہیں جو خاندانی اور عائلی زندگی سے تعلق رکھتی ہیں جیسے نکاح، مہر، نفقہ، طلاق، عدت، رضاعت، پرورش اولاد، اطاعت و خدمت والدین، حقوق زوجین سے متعلق تعلیمات، قرابتداروں کے حقوق، وصیت اور وراثت، نیز پڑوسیوں مسکینوں، فقیروں، یتیموں، معذوروں، مسافروں کے حقوق و مراعات سے متعلق تعلیمات، عورتوں اور غلاموں سے حسن سلوک، نیکی کے کاموں میں ایک دوسرے سے تعاون، بنی آدم کی حیثیت سے ہر آدمی کے احترام، باہمی میل جول میں مساوات، ایک دوسرے کے گھر میں آنے جانے اور کھانے پینے، مجالس میں شریک ہونے کے آداب، میل ملاپ میں محرم اور غیر محرم اور بالغ اور نابالغ کے درمیان فرق اور خواتین کے لباس اور حجاب سے متعلق تعلیمات بھی معاشرتی نوعیت کی ہیں، انہی معاشرتی تعلیمات میں وہ تعلیمات بھی داخل ہیں جن میں لعن طعن، غیبت و چغلی ایک دوسرے کا مذاق و تمسخر اڑانے، ایک دوسرے کو برے ناموں اور برے القاب سے پکارنے، دوسروں کے چھپے عیبوں کی جستجو کرنے اور ٹوہ لگانے، رنگ و نسل، نسب خاندان قبیلے کی بنا پر خود کو شریف اور دوسرے کو حقیر و ذلیل سمجھنے کی ممانعت ہے نیز وہ تعلیمات بھی جن میں ہر مظلوم کی حمایت اور جھگڑنے والوں کے درمیان عدل و انصاف کے ساتھ صلح و صفائی کرنے کا حکم ہے، بہرحال ان معاشرتی تعلیمات کا مقصد افراد معاشرہ کے باہمی تعلقات کو مستحکم اور خوشگوار بنانا ہے۔

اس تیسری قسم کی اجتماعی تعلیمات میں سے کچھ معاشی نوعیت کی ہیں ان میں وہ تمام تعلیمات شامل ہیں جو قدرتی وسائل رزق سے رزق حاصل کرنے، ابتغاء رزق اور کسب معاش کے لیے سعی و محنت اور جدوجہد کرنے، مال و متاع کمانے میں حلال و جائز طریقوں سے کام لینے اور حرام و ناجائز طریقوں سے بچنے، شخصی ملکیت کے جواز اور اثبات، انتقال ملکیت کے اسباب، تجارتی لین دین اور خرید و فروخت میں عدل و قسط، ماپ تول میں کمی بیشی، اکل بالباطل، ربوٰ، میسر و قمار، رشوت، چوری کی ممانعت سے متعلق ہیں، اسی طرح وہ تعلیمات بھی معاشی نوعیت کی ہیں جن میں تجارت، زراعت، گلہ بانی، اجرت پر محنت و مزدوری کرنے کا ذکر، اور ان لوگوں کی مذمت ہے جو محض جمع کرنے، بڑے سے بڑے مالدار

بننے اور دوسروں پر اپنی مالی برتری جتلانے کی غرض سے مال و منال کماتے اور ذخیرہ کرتے ہیں، اور جن کے اندر انفاقِ مال میں اسراف و تبذیر سے بچنے اور میانہ روی اختیار کرنے کا حکم ہے اور جن میں انفاق فی سبیل اللہ، زکوٰۃ و صدقات، قرضِ حسنہ کا بیان ہے، نیز جن میں مالِ غنیمت، فے، جزیہ کے احکام اور تقسیم مال کے ضابطے ہیں، بہرحال ان معاشی نوعیت کی تعلیمات سے مقصود یہ ہے کہ معاشرے کے تمام افراد کو معاشی خوشحالی کے ساتھ معاشی ترقی کے بھی مواقع حاصل ہوں، یعنی نہ صرف یہ کہ معاشرے کے ہر ہر فرد کو کسی نہ کسی شکل میں بالفعل اتنا سامان معاش ضرور میسر ہو جس کے بغیر عام طور پر ایک انسان اپنی طبعی عمر تک نہ اطمینان کے ساتھ زندہ رہ سکتا ہے اور نہ اپنے متعلقہ فرائض ٹھیک طور پر انجام دے سکتا ہے جو مختلف حیثیات سے اُس کے ذمہ پر عائد ہوتے ہیں، بلکہ اس کے ساتھ اس کے لیے ضرورت سے زیادہ سامانِ معاش کما سکنے کا موقع بھی ہو کیونکہ انسان صرف یہی نہیں چاہتا کہ اس کے پاس بقدرِ ضرورت سامانِ معاش ہو بلکہ یہ بھی چاہتا ہے کہ اس کے پاس اپنی ذاتی ضرورت سے زائد رزق و مال بھی ہو تاکہ وہ اُسے مصارفِ خیر میں خرچ کرکے خالق اور مخلوق کی خوشنودی اور اخلاقی و روحانی ترقی حاصل کر سکے۔

قرآن مجید کی ان اجتماعی تعلیمات میں سے کچھ تعلیمات سیاسی نوعیت کی بھی ہیں اور یہ وہ تعلیمات ہیں جن میں خلافت، حکومت، بادشاہت، مُلک، حکّام، اُولوالامر، شوریٰ اور ایسے امور کا ذکر ہے جو بطورِ خاص ریاست و حکومت سے تعلق رکھتے اور اُس کے فرائض و وظائف میں شمار ہوتے ہیں، جیسے ظلم و فساد کا استیصال اور اس کی جگہ معاشرے میں عدل و قسط کا قیام، یعنی افراد کے ہر قسم کے حقوق کا مکمل اور ٹھیک ٹھیک تحفظ، لوگوں کے باہمی نزاعات میں عدل و انصاف کے مطابق عدالتی فیصلے، جرائم کے انسداد کے لیے مجرموں کو سزائیں دینا اور حدود و تعزیرات جاری کرنا، دشمنوں کے وار سے بچنے اور اُن کا مقابلہ کرنے کے لیے فوج اور سامانِ جنگ کی تیاری اور دفاعی تدابیر اختیار کرنا، غیر مسلموں سے معاہدات کرنا، لوگوں کو اُن کے دینی و دنیوی فرائض و واجبات کی ادائیگی پر آمادہ اور تعلیم، تبلیغ اور جہاد کا انتظام و اہتمام کرنا، افتراق و انتشار کے اسباب کو دور کرکے لوگوں میں اتحاد، تنظیم اور یگانگت پیدا کرنا، معاشرے سے اُن اسباب و محرکات کو مٹانے کی کوشش کرنا جو برائیوں کو جنم دیتے اور بدامنی و بے چینی کا باعث بنتے ہیں، نیز ایسے ہنگامی اور وقتی قسم کے اجتماعی مسائل کا حل باہمی صلاح و مشورہ سے تلاش و تجویز کرنا جن کا فائدہ و ضرر پورے معاشرے سے جن کا فائدہ و ضرر پورے معاشرے کو پہنچتا ہو اور جن کے متعلق قرآن و سنت میں صرف اصولی ہدایت پائی جاتی ہو، اسی طرح اجتماعی

بیت المال کے لیے زکوٰۃ، صدقات، غنیمت، فے، خمس، جزیہ وخراج کے اموال جمع اور پھر اُن کو ان کے مقررہ مصارف میں خرچ کرنا، وغیرہ ظاہر ہے کہ یہ تمام مذکورہ امور حکومت و ریاست سے تعلق رکھتے اور سیاست کی تعریف میں آتے ہیں، اور جن کا مقصد پر امن اجتماعی ماحول اور سلامتی کی فضا قائم کرنا اور اپنے اجتماعی نصب العین کی طرف بڑھنا ہے۔

قرآنی تعلیمات کا ایک خاصا حصّہ وہ بھی ہے جو یہ بتلاتا ہے کہ وہ اچھے صفات کیا ہیں جن سے ایک مسلمان کو مزین اور آراستہ ہونا چاہیئے، اور وہ بُرے اوصاف کیا ہیں جو ایک مسلمان کے اندر نہ ہونے چاہئیں، اچھے صفات کی مثال، صداقت، امانت، شجاعت، سخاوت، وعدہ وفائی، پاکدامنی، نظافت تواضع، عاجزی، نرمی، صبر و تحمل، عفو و درگزر، استغناء، دوسروں کی ہمدردی و خیر خواہی وغیرہ اور بُرے اوصاف: جیسے کذب و جھوٹ، خیانت، بزدلی، بخل، عہد شکنی، بے حیائی، گندگی، فخر و تکبر، حسد و لالچ درشتگی و سخت مزاجی، غیظ و غضب، کتمان حق، مصلحت پرستی، نفاق وغیرہ۔ ان تعلیمات سے فرد کی انفرادی اور شخصی سیرت کی تعمیر ہوتی اور وہ ایک مثالی اسلامی معاشرے کا بہترین رکن ثابت ہوتا ہے گویا ان تعلیمات کا بھی اس مثالی معاشرے سے خصوصی تعلق ہے جس کا قیام اسلام کے پیشِ نظر ہے۔

اب میں اپنے مقالے کے اصل مقصد یعنی قرآن کی اخلاقی اور قانونی تعلیمات کے بارے میں کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں۔ قرآن مجید میں اجتماعی امور و معاملات سے متعلق جو تعلیمات ہیں خواہ وہ معاشرتی نوعیت کی ہوں یا معاشی و اقتصادی نوعیت کی، سیاسی نوعیت کی ہوں یا ثقافتی اور تہذیبی نوعیت کی، اسی طرح وہ ایجابی نوعیت کی ہوں یا امتناعی نوعیت کی، یعنی اُن میں کسی کام کے کرنے کا حکم ہو، یا کسی کام سے منع کیا گیا ہو، بلحاظ درجہ اور مرتبہ دو طرح کی ہیں۔ ایجابی تعلیمات میں کچھ واجب کے درجہ کی ہیں اور کچھ مستحب کے درجہ کی، اسی طرح امتناعی میں بعض حرام کے درجہ کی ہیں اور بعض مکروہ کے درجہ کی، مطلب یہ کہ اصل مقصد کے لحاظ سے جن کاموں کا کرنا ضروری ہے اُن سے متعلق تعلیمات فرض و واجب کا درجہ اور جن کاموں کا کرنا اگرچہ ضروری نہیں لیکن نہ کرنے سے اُن کا کرنا بہتر ہے۔ اُن سے متعلق تعلیمات مستحب کا مرتبہ رکھتی ہیں، اسی طرح جن اعمال کا نہ کرنا، مقصد کے لیے ضروری ہے۔ اُن سے متعلق تعلیمات کا درجہ حرام کا اور جن اعمال کا نہ کرنا، اُن کے کرنے سے بہتر ہے ان کے متعلق احکام کا درجہ، مکروہ کا ہے، اور یہ تقسیم دراصل اس مسئلے پر مبنی ہے کہ امر وجوب کے لیے بھی ہوتا ہے اور ندب و استحباب کے لیے بھی، اسی طرح نہی، تحریم کے لیے بھی ہوتی ہے اور کراہت و تنزیہ کے لیے بھی، چنانچہ قرآنی اوامر میں سے بھی بعض کو واجب پر اور بعض کو مستحب پر محمول کیا گیا ہے اسی طرح قرآن مجید کی نواہی میں سے بھی بعض کو تحریم

کے لیے اور بعض کو کراہیت کے لیے متعین کیا گیا ہے۔ رہا اس چیز کا تعین کہ کوئی امر وجوب کے لیے ہے یا استحباب کے لیے، یا کوئی نہی تحریم کے لیے ہے یا کراہیت کے لیے، سو وہ لفظی و معنوی قرائن سے بھی ہو سکتا ہے جو خود کلام میں موجود ہوتے ہیں اور عقلی و معروضی دلائل و شواہد سے بھی ہو سکتا ہے جو اس سے الگ ہوتے ہیں، مثلاً کسی امر و نہی اور ایجابی و امتناعی حکم کے ساتھ تاکیدی الفاظ ہوں، یا اس کی خلاف ورزی اور عدم پابندی پر دُنیوی، یا اُخروی سزا اور عذاب کی وعید اور دھمکی ہو تو اُس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ وہ امر اور حکم وجوب کے لیے اور وہ نہی اور امتناعی حکم تحریم کے لیے ہے، اسی طرح اس کا تعین اُن مقاصد کی روشنی میں بھی ہو سکتا ہے جن سے اِن اوامر و نواہی اور شرعی احکام کا تعلق ہے، بہرحال غور سے دیکھا جائے تو شرعی احکام کی یہ درجہ بندی ضروری اور صحیح معلوم ہوتی اور عقل و فطرت کے عین مطابق نظر آتی ہے۔

جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا میرے علم و فہم کے مطابق قرآن مجید کا منشاء یہ ہے کہ ایک ایسا معاشرہ وجود میں آئے جس کے اندر عدل اور احسان پایا جاتا ہو، لہٰذا اس نے اپنی تعلیمات میں عدل و احسان دونوں کو ملحوظ و مدنظر رکھا ہے، چونکہ عدل کے معنے ہیں۔ ایک دوسرے کو اس کا حق ٹھیک ٹھیک اور پورا پورا دینا، لہٰذا عدل پر مبنی تعلیمات کی خاصیت یہ ہے کہ ان پر عمل پیرا ہونے سے افراد کے حقوق ٹھیک ٹھیک محفوظ ہو جاتے اور ایک ایسا معتدل و متوازن اور خوشگوار اجتماعی ماحول وجود میں آتا ہے جس کے اندر ہر فرد کو اپنی طبعی عمر تک اطمینان کے ساتھ زندہ رہنے اور اپنی صلاحیتوں کے مطابق ترقی کرنے کا موقع ملتا ہے، اور اُن کی عدم پابندی اور خلاف ورزی سے ضرور حق تلفیاں واقع ہوتی، معاشرے کا اجتماعی توازن بگڑتا اور افراد کو بدامنی و بے چینی میں مبتلا ہونا پڑتا ہے۔ اور چونکہ احسان کے معنی ہیں۔ اپنے حق کا دوسرے کے لیے ایثار کرنا، یا دوسرے کی خاطر اپنے حق سے دستبردار ہو جانا، لہٰذا احسان پر مبنی تعلیمات کی خصوصیت یہ ہے کہ اُن پر عمل کرنے اور کاربند ہونے سے اجتماعی تعلقات زیادہ سے زیادہ مستحکم و خوشگوار بنتے اور اُس اجتماعی امن و اطمینان میں برابر اضافہ ہوتا ہے جو عدل پر مبنی تعلیمات پر عمل کرنے کے نتیجہ میں پہلے سے پیدا ہو چکا ہوتا ہے، لیکن اُن پر عمل نہ کرنے سے نہ تو کسی کی حق تلفی ہوتی، نہ کسی کو کوئی ضرر و نقصان پہنچتا اور نہ معاشرے میں کوئی بدامنی و بے چینی ظہور میں آتی ہے۔ دوسرا فرق ان دو قسم کی تعلیمات کے درمیان یہ کہ عدل والی تعلیمات لازمی اور جبری ہیں جبکہ احسان والی تعلیمات جبری نہیں اختیاری ہیں، عدل والی تعلیمات کی خلاف ورزی گناہ اور قابل تعزیز جرم ہے جبکہ احسان والی تعلیمات کی خلاف ورزی نہ گناہ ہے اور نہ قابل سزا جرم، یہی وجہ ہے کہ حکومت

عدل والی تعلیمات کی پابندی پر تو مسلمان شہریوں بلکہ سب شہریوں کو مجبور کر سکتی ہے کیونکہ اس کے وجود کا اصل مقصد، معاشرے میں عدل و قسط کا قیام ہے لہٰذا اس کا یہ منصبی فریضہ قرار پاتا ہے کہ ہر وہ کام اور تصرف کرے جس سے عدل قائم ہو سکتا ہو، اور چونکہ یہ عدل، عدل والی تعلیمات پر عمل کرنے کرانے سے قائم ہو سکتا ہے لہٰذا ان تعلیمات کا نفاذ اور تحفظ حکومت کا فریضہ ٹھہرتا ہے، لیکن اسلامی حکومت کسی کو احسان والی تعلیمات کی پابندی پر مجبور نہیں کر سکتی، البتہ ایک اسلامی حکومت جس کے اسلامی فرائض میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ بھی ہے افراد کو احسانی تعلیمات پر عمل کی ترغیب ضرور دلا سکتی ہے جس کی صورت یہ کہ جو افراد ان احسانی تعلیمات پر عمل پیرا ہوں انہیں خاص مراعات اور قومی اعزازات سے نواز کر ان کی عزت افزائی اور حوصلہ افزائی کر سکتی ہے بلکہ اُسے ایسا ضرور کرنا چاہیئے۔

ایک اور فرق ان دو قسم کی تعلیمات کے مابین یہ بھی ہے کہ عدل میں چونکہ ایک شخص دوسرے کو اس کا واجبی حق دیتا، جبکہ احسان میں وہ اپنے حق کا دوسرے کے لیے ایثار کرتا ہے لہٰذا نیکی اور اجر و ثواب میں عدل کا درجہ احسان سے کم اور دُوسرا ہے، عدل کے مقابلہ میں احسان کرنے والے کو ہر دین و مذہب اور ہر سوسائٹی میں زیادہ عزت و احترام کی نظر سے دیکھا جاتا ہے گویا دین و دانش دونوں کے نزدیک احسان، عدل سے بہتر ہے، اگر عدل اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰی ہے تو احسان عین تقویٰ ہے جس سے بڑھ کر کوئی نیکی اور اچھائی نہیں۔

ان دونوں کے درمیان ایک فرق یہ بھی ہے کہ عملی ترتیب کے لحاظ سے عدل پہلے اور احسان اس کے بعد ہے جو شخص عدل پر عمل پیرا نہ ہو وہ احسان پر عمل نہیں کر سکتا، مطلب یہ کہ جو شخص دوسروں کو اُن کا واجبی حق ٹھیک ٹھیک نہ دیتا ہو وہ اپنے حق کا دوسروں کے لیے ایثار کیسے کر سکتا ہے غالباً یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید کی آیت اِنَّ اللّٰہَ یَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ، میں عدل کا حکم احسان کے حکم سے پہلے اور مقدم ہے۔

ایک فرق عدل اور احسان کے درمیان یہ بھی ہو سکتا ہے کہ عدل کا عملی مصداق اپنے کم و کیف کے لحاظ سے متعین ہے حالانکہ احسان کا عملی مصداق اور مطلب کم و کیف کے اعتبار سے متعین نہیں، بالفاظ دیگر عدل کی ہر معاملے میں ایک ہی متعین شکل ہوتی ہے جبکہ احسان کی متعدد شکلیں ہو سکتی ہیں، مثال کے طور پر ایک متاجر نے اجیر سے بیس روپے یومیہ پر معاملہ کیا، کام ختم ہونے پر وہ شام کو اجیر کو پورے بیس روپے دیتا ہے تو اس معاملے میں یہ عدل ہے جس کی ایک ہی متعین شکل ہے، اور اگر اس کو بیس روپے سے زائد دیتا ہے تو یہ احسان ہے، اس زائد کی چونکہ کثیر التعداد

شکلیں ہوسکتی ہیں زائد ایک پیسہ بھی ہوسکتا ہے ایک روپیہ بھی ہوسکتا ہے پانچ روپے، دس روپے بیس روپے، سو روپے بھی ہوسکتے ہیں لہٰذا اس کے مطابق احسان کی سینکڑوں عملی شکلیں ہوسکتی ہیں، اسی طرح اس مثال میں اجیر کو بیس روپے سے ایک پیسہ کم دینا بھی ظلم، ایک روپیہ کم دینا بھی ظلم، پانچ اور دس روپے کم دینا بھی ظلم اور پورے کے پورے بیس نہ دینا بھی ظلم ہے لہٰذا مثال مذکور میں ظلم کی تقریباً دو ہزار شکلیں ہوسکتی ہیں لیکن عدل کی صرف ایک ہی متعین شکل ہے اور وہ ہے پورے بیس روپے دینا جو شروع میں بطور حق طے ہوئے، اس مثال سے یہ بھی واضح ہوا کہ عدل، احسان اور ظلم کے درمیان حد فاصل اور مابہ الامتیاز ہے اس کی ایک طرف کا نام احسان اور دوسری طرف کا نام ظلم ہے، اور یہ کہ عدل کا میدان محدود اور احسان کا میدان غیر محدود ہے اس میں ایک انسان جتنی چاہے جولانیاں دکھا سکتا ہے، اور یہ کہ احسان وہ سعادت ہے جس میں انسان ایک دوسرے پر مسلسل سبقت و برتری حاصل کرسکتے ہیں، اور یہ کہ عدل کے مقابلہ میں احسان ہمیشہ ایک آئیڈیل رہتا ہے اس لیے کہ وہ کبھی بھی آخری طور پر عمل میں نہیں آسکتا۔

قرآن مجید کی ان دو قسم کی تعلیمات عدلی اور احسانی کی خصوصیات کے بارے میں جو تفصیل عرض کی گئی ہے اس سے بخوبی واضح ہوجاتا ہے کہ ان دو قسم کی تعلیمات کے مابین مختلف وجوہ سے کیا فرق و امتیاز ہے۔

سامعین کرام! آپ یہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ قرآن و حدیث اور قدیم عربی لٹریچر میں لفظ قانون کا کہیں کوئی ذکر نہیں دراصل یہ لفظ عربی نہیں بلکہ یونانی یا سریانی ہے، یونانی کتابوں کے جب عربی زبان میں ترجمے ہوئے تو لفظ قانون کو بعینہٖ لے لیا گیا، لکھا ہے کہ اس کا لغوی معنیٰ تو کتاب کی ایک سطر تھا لیکن اصطلاح میں قانون کا مطلب ایک ایسا اصل کلی قرار پایا جو اپنی تمام جزئیات پر منطبق ہوتا اور اُن کے احکام و احوال کی معرفت کا ذریعہ بنتا ہے۔ دستور العلماء نامی کتاب میں قانون کی دو تعریفیں لکھی ہیں: ایک یہ کہ: "القانون ھو الامر الکلی المنطبق علی جمیع جزئیاتہ التی یتعرف احکامھا منہ" اور دوسری یہ کہ "القانون قضیۃ کلیۃ تعرف بالقوۃ القریبۃ من الفعل احوال جزئیات موضوعھا" اس دوسری تعریف کے بموجب قانون اور قاعدہ دونوں ہم معنے ہوجاتے ہیں کیونکہ قاعدہ کی بھی یہی تعریف کی گئی ہے۔

ان دو تعریفوں کے مطابق قانون کا اطلاق، وضعی علوم و فنون کے اُن قواعد کلیہ پر بھی ہوتا اور ہوسکتا ہے جن سے علم و فن کے جزوی مسائل سمجھنے اور حل کرنے میں مدد ملتی ہے، خواہ وہ قواعد کلیہ

گرامر اور صرف و نحو کے ہوں یا منطق و فلسفہ کے، ریاضی اور طبیعیات کے ہوں یا طب اور کیمیا کے، عمرانیات کے ہوں یا معاشیات اور سیاسیات کے۔ اسی طرح ان تعریفوں کے لحاظ سے قانون کا اطلاق ان اصول و ضوابط پر بھی ہوتا اور ہو سکتا ہے جن کے مطابق دیوانی اور فوجداری عدالتیں لوگوں کے باہمی تنازعات کا تصفیہ اور مقدمات کے فیصلے کرتی ہیں قطع نظر اس سے کہ وہ اصول و ضوابط دینی ہیں یا غیر دینی وہ کس نے وضع کیے اور کہاں سے آئے، نیز اس لحاظ سے قانون کا اطلاق اُن معاشرتی، معاشی اور سیاسی طور طریقوں اور رسموں، رواجوں اور عرفوں پر بھی ہو سکتا ہے جنکو قبول عام کی حیثیت حاصل ہو جاتی لوگ احترام کے ساتھ اُن کی پابندی کرتے اور اُن کے مطابق زندگی گزارتے ہیں خواہ ان کا ماخذ و سرچشمہ کچھ بھی کیوں نہ ہو۔

علماء قانون نے اپنی کتابوں میں قانون کی جو اصطلاحی تعریفیں لکھی ہیں وہ متعدد اور مختلف ہیں، اُن میں سے ایک تعریف کچھ اس طرح ہے: "قانون ظاہری انسانی افعال کا عام قاعدہ ہے جسے کوئی اعلیٰ حاکم نافذ کرے اور جس کی پابندی تعزیراً لازم ہو" اس تعریف سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ علمائے قانون کے نزدیک صرف وہی عام ضابطہ اور کلی قاعدہ قانون کا مصداق ہوتا ہے جس میں تین باتیں ہوں ایک یہ کہ وہ انسان کے ظاہری اعمال و افعال سے متعلق ہو، دوم اُسے نافذ کرنے والی ہستی صاحب حکومت و اقتدار ہو، یعنی جس کے نفاذ کا تعلق حکومت سے ہو، اور سوم یہ کہ اس کی پابندی لازمی و جبری اور خلاف ورزی قابل تعزیر جرم ہو۔

بنابریں قانون کی پہلی دو تعریفوں کے مطابق قرآن مجید کی وہ تمام تعلیمات جن کے اندر حیات انسانی کے مختلف النوع مسائل کے متعلق اصول کلیہ اور ضوابط عامہ بیان ہوئے ہیں خواہ وہ عدل پر مبنی ہوں یا احسان پر، اسی طرح وہ اجباری قسم کے ہوں یا اختیاری قسم کے، وہ تمام تعلیمات، قانونی تعلیمات کا مصداق قرار پاتی ہیں، جبکہ قانون کی تیسری تعریف جو علماء قانون کے حوالے سے نقل کی گئی ہے۔ قرآن مجید کی صرف وہ تعلیمات، قانونی تعلیمات کے ذیل میں آتی ہیں جو عدل پر مبنی اور جن کی پشت پناہی کا تعلق حکومت سے ہوتا ہے۔

اسی طرح علم الاخلاق کی کتابوں میں علماء اخلاق نے اخلاق کی جو تعریفیں لکھی ہیں ان کے درمیان بھی اختلاف ہے، بعض تعریفوں کے مطابق ہر نیکی اور اچھائی اخلاق کا مصداق قرار پاتی ہے خواہ وہ عدل سے تعلق رکھتی ہو، یا احسان سے، اور بعض دوسری تعریفوں کے مطابق، سب نیکیاں اور اچھائیاں نہیں بلکہ بعض مخصوص قسم کی نیکیاں اور اچھائیاں اخلاق کے تحت آتی ہیں جو احسان سے تعلق

رکھتی ہیں، لہٰذا اخلاقی کی پہلی تعریف کی رو سے قرآن مجید کی تمام تعلیمات، اخلاقی تعلیمات اور دوسری تعریف کی رو سے صرف بعض تعلیمات اخلاقی قرار پاتی ہیں۔

بہر حال قانون اور اخلاق کی بعض تعریفوں کے بموجب یہ کہا جاسکتا ہے کہ قرآن مجید کی جو تعلیمات عدل پر مبنی ہیں وہ قانونی اور جو احسان پر مبنی ہیں وہ اخلاقی تعلیمات ہیں اور جن کے مجموعے کا نام شریعت ہے۔

مقالہ ختم کرنے سے پہلے قرآنی تعلیمات کی ایک اور قسم کی طرف توجہ مبذول کرانا مناسب سمجھتا ہوں جو ہیں تو اس لحاظ سے قانونی نوعیت کی کہ اپنے وقت پر اُن کی پابندی لازمی و ضروری اور اُن کے نفاذ اور تحفظ کی ذمہ داری حکومت پر ہے لیکن چونکہ تعلیمات کی اس قسم کا تعلق مسلم معاشرے کے عبوری اور ہنگامی حالات سے ہے۔ لہٰذا ان کو عبوری اور غیر مستقل قانونی تعلیمات سے تعبیر کیا جاسکتا ہے، یہ تعلیمات نہ عدل پر مبنی ہیں اور نہ احسان پر بلکہ وقتی مصلحت پر مبنی ہیں جس کا مطلب ہے معاشرے میں پہلے سے موجود ظلم و فساد میں کچھ کمی اور اجتماعی حالت کی نسبتہً کچھ بہتری۔

اس اجمال کی کچھ تفصیل یہ کہ جیسا کہ پہلے عرض کیا گیا کہ قرآن مجید کی وہ تعلیمات جن کی بنیاد عدل اور احسان پر ہے۔ ان کے صحیح طور پر عمل میں آنے اور پائداری کے ساتھ قائم رہنے کے لیے ایک خاص طرح کا ذہنی اور خارجی ماحول ضروری اور شرط مقدم ہے۔ خاص طرح کے ذہنی ماحول سے مُراد وہ ماحول ہے جو ایمانی عقائد کی تعلیم سے وجود میں آتا اور اسلامی عبادات کی تربیت سے قائم، زندہ اور بیدار رہتا ہے جس کی بعض خصوصیات کی پہلے کچھ وضاحت پیش کی جاچکی ہے اور خاص طرح کے خارجی ماحول سے مُراد ہے مسلم معاشرے کا اپنی معاشی ضروریات کے لحاظ سے خود کفیل و مستغنی اور سیاسی امور کے لحاظ سے مکمل آزاد اور خود مختار ہونا۔ ظاہر ہے کہ جو مسلم معاشرہ اپنی معاشی ضروریات کے لیے غیر مسلموں کا محتاج اور دست نگر، اور سیاسی لحاظ سے غلام اور ان کی مرضی کا پابند ہو وہ کبھی بھی اسلام کے حقیقی عملی نظام پر عمل پیرا نہیں ہوسکتا، اسی طرح وہ معاشرہ بھی اسلام کے حقیقی عملی نظام پر عمل پیرا نہیں ہوسکتا جس کے اندر وہ ذہنی فضا موجود نہ ہو جس کے ساتھ اسلام کے عملی نظام کا نہایت گہرا اور مضبوط تعلق ہے۔

البتہ جس مسلم معاشرے میں اب تک وہ خاص طرح کا ذہنی اور خارجی ماحول پیدا نہ ہوسکا اور وہ ایک بین بین حالات سے گزر رہا ہو یعنی نہ اس کے اندر عمومی طور پر عدل و احسان کے عالمگیر جذبات و احساسات ذہنوں میں پائے جاتے ہوں اور نہ وہ معاشی ضروریات کے لحاظ سے پوری طرح خود کفیل

اور سیاسی لحاظ سے پوری طرح آزاد و خود مختار ہو بلکہ اس کی حالت درمیانی سی ہو وہ چونکہ اسلام کی عدل و احسان والی تعلیمات کو پوری طرح اپنا نہیں سکتا، لہٰذا اُس کے مخصوص حالات کے پیشِ نظر قرآن حکیم اس کو ایسے احکام و قوانین اختیار کرنے اور ان پر عمل پیرا ہونے کی اجازت دیتا ہے جو اگرچہ اسلام کے اصل منشاء کے مطابق اور درست نہیں ہوتے لیکن چونکہ اُن حالات میں وہی اس کے لیے قابلِ عمل ہوتے اور انہی کے ذریعے اسکی کچھ نہ کچھ اصلاح ہو سکتی اور نسبتاً اسکی اجتماعی حالت بہتر بن سکتی ہے لہٰذا ایسے معاشرے کے لیے اُن مجبوری قسم کے احکام و قوانین پر عمل کرنے کا جواز پیدا ہو جاتا ہے اور یہ جواز صرف اس وقت تک قائم رہتا ہے جب تک کہ وہ ذہنی اور معنوی حالات بدل نہیں جاتے جن کے ساتھ اس جواز کا تعلق ہوتا ہے۔

غور سے دیکھا جائے تو یہ مجبوری احکام و قوانین جس حکمت عملی پر مبنی نظر آتے ہیں وہ یہ کہ جب دو برائیوں میں سے ایک کا اختیار کرنا ضروری اور ناگزیر ہو تو اُن میں سے اس کو بادلِ نخواستہ اختیار کر لیا جائے جو ضرر میں نسبتہً کم درجہ کی ہو، اور یہ کہ وہ تھوڑی صلاح و بہتری جو پائدار ہو اُس زیادہ صلاح و بہتری پر ترجیح رکھتی ہے جو ناپائدار ہو، اور چونکہ یہ حکمت عملی دین و دانش اور عقل و فطرت کے عین مطابق ہے لہٰذا اس پر مبنی احکام و قوانین کے صحیح و درست ہونے میں کوئی شک و شبہ نہیں ہو سکتا۔ البتہ اس بارے میں یہ بات خاص طور پر یاد رکھنے کی ہے کہ مذکورہ حکمت عملی کی رو سے صرف اس مسلم معاشرے کو مجبوری احکام و قوانین اختیار کرنے کی اجازت ہوتی ہے جس نے یہ طے کر لیا ہو کہ وہ بالآخر اسلام کے حقیقی اور کامل عملی نظام کو اپنائے گا اور وہ اس کے لیے بساط بھر اور حتی الوسع سعی و کوشش میں مصروف بھی ہو۔

اسلام کی انقلابی قدروں کا علمبردار

ماہنامہ میثاق لاہور

مدیر: ڈاکٹر اسرار احمد

خود پڑھیے اور دوسروں کو پڑھائیے

فی شمارہ تین روپے ــــ سالانہ زرِ تعاون تیس روپے

قریبی بک اسٹال سے حاصل کریں یا ہم سے طلب فرمائیں

مکتبہ تنظیم اسلامی ــــ ۳۶-کے، ماڈل ٹاؤن، لاہور

فون نمبر- ۸۵۲۶۱۱

مولانا عبید اللہ سندھیؒ

اور

ان کی تفسیر "المقام المحمود"

ہمارے عزیز دوست ڈاکٹر میر احمد مغل نے مولانا عبید اللہ سندھیؒ کی تفسیر قرآن پر سندھ یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ اس مقالہ کی اشاعت سے قبل ان کی خواہش ہوئی کہ مولانا عبید اللہ انور رحمہ اللہ تعالیٰ اسے ملاحظہ فرما کر اس پر مقدمہ لکھیں۔ مولانا بجا طور پر اس کے اہل تھے اور انہوں نے ذوق و شوق سے ایک ایک حرف پڑھا۔ لیکن انہوں نے مجھ سے خواہش کی کہ میں اسے پڑھ کر اس پر مقدمہ لکھوں۔ میرے لئے مولانا کی خواہش حکم کا درجہ رکھتی تھی اس لئے میں نے بالاستیعاب اس کو پڑھ کر "مقدمہ" سپرد قلم کیا جسے مولانا انورؒ اور دوسرے اہل علم نے بہت سراہا۔

مقالہ کے ناشر نے بوجوہ سارا مقدمہ چھاپنے کے بجائے اس کے بعض اقتباس شائع کر دیئے۔ یہ تحریر جو میں نے بڑی محنت سے تیار کی تھی میرے کاغذات میں پڑی رہی۔ چند دن قبل کسی ضرورت سے اپنے کاغذات چھانٹ رہا تھا کہ اچانک یہ تحریر سامنے آئی۔

میں نے اسے ۱۱ صفر ۱۴۰۳ھ مطابق ۲۸ نومبر ۱۹۸۲ کو مکمل کیا اور آج ٹھیک تین سال بعد اسے "حکمت قرآن" کے ذریعہ قارئین تک پہنچا رہا ہوں اس میں جہاں ایک قیمتی تفسیر کا تفصیلی تعارف ہے۔ وہاں تاریخ کی بعض گم شدہ کڑیوں کا بھی سراغ ہے، جسے امید کہ پسند کیا جائے گا۔ ممکن ہے کسی مقام پہ کسی دوست کے لئے کوئی تلخی کی بات ہو۔ اس پہ پیشگی معذرت خواہ ہوں

"فقیر ـــــ العلوی"

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

حضرت الشیخ عبدالحق محدّث دہلوی قدس سرّہٗ سید صدرالدین بخاری رحمہ اللہ تعالیٰ کا قول نقل کرتے ہیں کہ :

"دو نعمت در عالم بالفعل موجود است کہ فوق جمیع نعمتہا است ولیکن مردم قدر آں نعمت نمی شناسند و بداں پے نمی برند ۔۔۔ یکے آں کہ وجود مبارک محمد مصطفیٰ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ واصحابہ وسلّم بصفت حیات در مدینہ موجود است ...... و دیگر آں کہ قرآں مجید کہ کلام پروردگار است و وے سبحانہ تعالیٰ بے واسطہ بداں متکلّم ۔"

(اخبار الاخیار صد ۲۱۵)

کہ دنیا میں بالفعل دو نعمتیں موجود ہیں جو تمام نعمتوں سے بڑھ کر ہیں لیکن لوگ ان کی قدر نہیں پہچانتے اور ان کے مطابق زندگی نہیں گزارتے ۔ ان نعمتوں میں ایک نعمت تو حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ واصحابہ وسلّم کا وجود مبارک ہے جو "بصفت حیات" مدینہ طیبہ میں موجود ہے اور دوسری نعمت "قرآن کریم" ہے جو اللہ تعالیٰ کا کلام ہے اور حضرت حق اس کے ساتھ بغیر کسی واسطہ تکلّم فرماتے ہیں ۔ شیخ دہلوی قدس سرہٗ نے جو بات فرمائی، کیا یہ ان کی اپنی ذہنی اختراع ہے ؟ نہیں بلکہ فی الحقیقت یہ تو ایک ارشادِ پیغمبر کی حسین تعبیر ہے ۔

تَرَکْتُ فِیْکُمْ اَمْرَیْنِ لَنْ تَضِلُّوْا مَا تَمَسَّکْتُمْ بِہِمَا کِتَابُ اللّٰہِ وَسُنَّۃُ رَسُوْلِہٖ — عَنْ انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ مرسلاً فی الموطا ۔

گویا "کتاب اللہ" اور "سنّتِ رسولؐ" جو وجود مبارکہ موجودہ بصفت حیات فی المدینہ کے اعمال وافعال کا نام ہے، انہی کی پیروی واتباع ہدایتِ ابدی کا ذریعہ اور خسرانِ دارین سے بچنے کا وسیلہ ہیں —— اور یہی مقصد ہے شیخ دہلوی علیہ الرحمہ کا ۔

حضور نبی مکرّم علیہ السّلام کے اس ارشاد مقدسہ کا منبع دراصل قرآن عزیز کی وہ آیت ہے جس کے متعلق اہل ہوا بلا وجہ الجھتہ اور نزاع کا شکار ہوتے ہیں ۔ سورۃ المائدہ کی مشہور آیت ہے

قَدْ جَاءَکُمْ مِّنَ اللّٰہِ نُوْرٌ وَّکِتَابٌ مُّبِیْنٌ

امامِ انقلاب مولانا عبید اللہ سندھی رحمہ اللہ تعالیٰ کے شیخ گرامی شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی قدس سرہ ترجمہ فرماتے ہیں :

"بے شک تمہارے پاس آئی اللہ کی طرف سے روشنی اور کتاب ظاہر کرنے والی"

اور متصل اگلے ٹکڑے میں فرمایا:

"جس سے اللہ ہدایت کرتا ہے اس کو جو تابع ہوا اس کی رضا کا، سلامتی کی راہیں اور ان کو نکالتا ہے اندھیروں سے روشنی میں اپنے حکم سے ان کو چلاتا ہے سیدھی راہ ــــــ ا"

حضرت العلام مولانا شبیر احمد عثمانی قدس سرہٗ اس آیتِ مبارکہ سے متعلق اپنے حواشی میں فرماتے ہیں:

شاید "نور" سے خود نبی کریم صلّی اللہ تعالیٰ علیہ وسلّم (بطور نور ہدایت ــــ ناقل)
اور کتاب مبین "سے قرآن کریم مراد ہے۔
(حواشی مولانا عثمانی مطبوعہ مکتبہ نورانی لاہور ۱۳۷۸ھ)

ان دو عظیم نعمتوں میں سے ایک نعمت حضور اقدس علیہ السّلام کا وجود مبارکہ ہے جن کی زبان سے نکلنے والے ایک ایک لفظ کے مقابلہ میں دنیا و مافیہا کی کوئی حقیقت نہیں اس "صاحب جوامع الکلم" نے دوسری نعمت یعنی قرآن عزیز جو اسی کے قلبِ انور پہ نازل ہوئی کے متعلق واضح طور پہ ارشاد فرما دیا کہ:

اللہ تعالیٰ نے قوموں کے عروج و زوال کا معاملہ قرآن سے متعلق کر دیا ہے
(عن عمر فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ فی مسلم۔ مشکوٰۃ ص۱۸۴)

اور حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے بقول ارشاد فرمایا کہ:

لوہے کیطرح دل بھی زنگ آلود ہو جاتے ہیں، اس پہ صحابہ کرام علیہم الرضوان کا سوال قدرتی امر تھا کہ دما جلاؤ ھا؟ کہ پھر اس کی صفائی کیونکر ممکن ہو گی؟ اس پہ فرمایا:

كَثْرَةُ ذِكْرِ الْمَوْتِ وَتِلَاوَةُ الْقُرْآنِ (مشکوٰۃ ص۱۸۹)

اس "نعمت کبریٰ" یعنی قرآن عزیز کے علوم عالیہ مہبط وحی صلّی اللہ علیہ و اصحابہ وسلّم سے انہی حضرات نے سیکھے جن کے لئے اللہ تعالیٰ اس دربارِ دُربار کی حاضری مقدر فرما چکے تھے، انہوں نے (اللہ کی ان پہ سلامتی ہو) حجۃ الوداع میں کی گئی نصیحت کو پلے باندھا اور اِدھر اُدھر پھیل کر اس روشنی کو بکھیرنا شروع کر دیا، ان ہزاروں قدوسیوں سے لاکھوں نے سیکھا اور پھر چراغ سے چراغ جلتے رہے، اور ایسا ہونا ضروری تھا تاکہ حق کی روشنی صبح قیامت تک باقی رہے اور

کسی کو مَاجَاءَنَا مِنْ نَذِيْرٍ کہنے کا موقعہ نہ ملے، یوں بھی دنیا کے سب سے بڑے سچّے انسان نے اس طرف واضح اشارہ فرمایا:

عن معاویۃ رضی اللہ تعالیٰ عنہ قال سَمِعْتُ النَّبِيَّ صَلَّى اللهُ تعالیٰ علیہ واصحابہ وسلّم يَقُوْلُ لَا يَزَالُ مِنْ اُمَّتِيْ اُمَّةٌ قَائِمَةٌ بِاَمْرِ اللهِ لَا يَضُرُّهُمْ مَّنْ خَذَلَهُمْ وَلَا مَنْ خَالَفَهُمْ حَتّٰى يَاْتِيَ اَمْرُ اللهِ وَهُمْ عَلٰى ذَالِكَ (مشکوٰۃ صـ۵۸۲)

اس "اُمّۃ قائمۃ بامر اللہ" کی تاریخ دعوت وعزیمت ہی ملّت کا اصل سرمایہ ہے اور دنیا کے ہر گوشہ و خطّہ میں مختلف اوقات میں اس جماعت حقّہ کے اعیان و اکابر کی فہرست بڑی طویل ہے۔ ان حضرات کی خوبی و کمال تھا تو بس اتنا کہ انہوں نے مقصدِ زندگی پا لیا تھا اور پھر زندگی کے محدود شب و روز کو اس کے حصول کے لئے داؤ پر لگا دیا تھا۔ ان اعاظم رجال میں ایک نام امام انقلاب مولانا عبید اللہ سندھی کا ہے جن کے دم واپسیں کی نقشہ کشی مرحوم کے عزیز اور تربیت یافتہ خادم مولانا عبید اللہ انور نے اس طرح کی۔

''حضرت سندھی کا انتقال دین پور (ضلع رحیم یار خان) میں ۲۲ اگست (۱۹۴۴ء) بحالت صوم عین اذان عصر کے وقت ہوا میں اس وقت ان کے قریب وضو بنا رہا تھا کہ کان میں آواز آئی فوراً حاضر ہوا۔ اس وقت کلمہ طیبہ کا ورد فرما رہے تھے اور میرے دیکھتے دیکھتے جان جان آفریں کے سپرد فرما دی۔ اس سے کچھ ہی دیر پہلے خود میں نے انہیں وضو کرایا تھا اور پھر بعد میں غسل دینے کا شرف بھی اس عاجز حقیر کو حاصل ہوا جس میں دین پور شریف کے صاحبزادگان بھی شریک تھے۔ رحمۃ اللہ علیہ واسعاً کثیرا۔

(ڈاکٹر منیر احمد مغل کے مقالہ پی ایچ ڈی بہ سلسلہ تفسیر مولانا سندھی زیر مولانا انور کا نوٹ صـ۱۱۱×۷ غیر مطبوعہ)

۷۲ سال کے اس تھکے ہارے مسافر کی یہ عظمت کہ ماہ اگست جیسے تلخ ترین موسم میں "صوم" کا اہتمام ہے اور کلمہ مبارکہ کا ورد کرتے ہوئے اس وقت مالک حقیقی کے دربار میں حاضری ہوتی ہے جو صلوٰۃ وسطیٰ کا وقت ہے اور جس میں بفحوائے حدیث نبوی رات دن کے ملائکہ کا زمین پر ہجوم ہوتا ہے۔ ربّ اکبر کی یہ عنایت و نوازش اپنے ایک بندے پر کیوں؟

اس کیوں کا جواب بالکل واضح ہے کہ جس نے اپنی روح کو اس خالق کائنات کے کلام

میں غرق کر دیا وہ روح اس عنایت کی مستحق تھی کہ کلام اتارنے والے کا وعدہ ہے ۔ وَکَانَ اللّٰہُ شَاکِرًا عَلِیۡمًا (النسا) اور اللہ تعالیٰ قدر دان ہے سب کچھ جاننے والا

وہ بندۂ خدا" سکھ دھرم" کے ماننے والے ایک گھرانے کا فرد تھا۔ فطرت سلیمہ نے سکول کی تعلیم کے دوران اس کو جھنجھوڑا اور وہ دنیا کی حقیقی سچائی کا پرستار بن کر اس راستہ پر چل نکلا اور ایسا کہ پھر ساری عمر اس سچائی کی تبلیغ کی۔ دس برس سے زائد کا وقت سرزمین حرم پر اس نے گزارا اور اس کی زندگی کے یہ وہ سال تھے جب شعور، تجربہ، علم ہر چیز پختہ سے پختہ تر ہو جاتی ہے۔ وہ ساری عمر قرآن کا طالب علم تھا۔ اس عمر میں البلد الامین میں پہنچ کر اس نے اس شہر مقدس کے شیوخ سے استفادہ میں عار محسوس نہ کی ـــــ اُطْلُبُوا الْعِلْمَ مِنَ الْمَھْدِ اِلَی اللَّحْدِ کے نبوی ارشاد کی جی بھر کر تعمیل کی۔ مولانا فرماتے ہیں :

"مجھے اہل مکہ سے تین ہندوستانی اور ایک عرب خاندان نے خاص طور پر علمی امداد دی۔"

(ذاتی ڈائری مطبوعہ لاہور ۱۹۴۶ء ص ۲۵ و مطبوعہ اسلام آباد ص ۱۴ بعنوان سرگزشت کابل (قومی ادارہ برائے تحقیق تاریخ و ثقافت)

اس سرزمین پاک پر مرحوم کی جو علمی دلچسپیاں تھیں ان کا ذکر خود ہی کرتے ہیں کہ :

"میں یقیناً ۱۲-۱۳ سال سے قرآن عظیم اور حجۃ اللہ البالغہ کا بہ نظر عمیق مطالعہ کرتا رہا۔ تفسیر قرآن عظیم میں جس قدر مقامات میرے لیے مشکل تھے اس زمانہ میں انہیں امام ولی اللہ دہلوی کے اصول پر بالاطمینان حاصل کر سکا ......

مجھے اپنے اصول پر قرآن عظیم میں اس زمانہ میں قابل عمل تعلیم کا ایک عملی نصاب نظر آیا اس میں اس تجلی ریز مقدس مقام کی تاثیر ضرور ماننا پڑتی ہے ۔

(ذاتی ڈائری ص ۲۵-۲۶، سرگذشت کابل ص ۱۲)

اسی ضمن میں آگے مولانا فرماتے ہیں کہ میں نے اس زمانہ میں امام دہلوی کی کتابیں مثلاً بدور بازغہ، خیر کثیر، تفہیمات الٰہیہ، سطعات، الطاف القدس، ہمعات وغیرہ کا مطالعہ جاری رکھا اور ان کیلئے بطور مفتاح امام دہلوی کے فرزند مولانا رفیع الدین کی تکمیل الاذہان، پوتے مولانا اسمٰعیل شہید کی عبقات اور آئندہ چل کر ان کے علوم کے وارث مولانا محمد قاسم نانوتوی کی قاسم العلوم، تقریر دلپذیر اور آب حیات زیر مطالعہ رکھیں ـــــ مزید فرماتے ہیں :

مجھے لوگوں کے پڑھانے کا بھی موقعہ ملتا رہا اور ساتھ ہی تدریس قرآن حکیم بھی جاری رہی اس سے

میرے نظریات بہت وسیع ہو گئے (ﷲ الحمد)

مولانا رحمہ اللہ تعالیٰ قرآن عزیز کے اتنے بڑے سکالر تھے کہ آپ کے استاذ اکبر حضرت شیخ الہند قدس سرہٗ نے دنیائے قدیم و جدید کے فضلاء کو قرآن پڑھانے کے لئے آپ کو مامور کیا جس میں آپ کے فرزند نسبتی اور عزیز از جان شاگرد مولانا احمد علی لاہوری بھی شریک تھے ـــ پھر ہم دیکھتے ہیں کہ علامہ عبداللہ یوسف علی جیسا شخص آپ سے قرآن کے مشکل مقامات کی تفسیر و تشریح معلوم کر رہا ہے۔ (سرگذشت کابل ص۷۵)

عبداللہ یوسف علی خاں ۱۳۵۲ھ میں حج کے ارادے مکہ مکرمہ آیا۔ یہ صاحب لوزان کانفرنس میں وزیر اعظم برطانیہ کے سیکرٹری تھے۔ مکہ میں ان کا قیام احسان اللہ خان بہادر نائب کونسل جدہ کے یہاں تھا اور مولانا سندھی کا مکان ان سے قریب تر، اس نے مولانا سے بعض آیات کا مطلب پوچھنا چاہا ـــ ملاقات ہوئی تو اس نے ایک آیت کا مطلب دریافت کیا، مولانا نے فرمایا:

> یار اس بات کو چھوڑو، پیچھے بیان کریں گے، پہلے یہ بتلاؤ کہ انگلستان کا وزیر اعظم کیوں اتنی عجلت کے ساتھ ہوائی جہاز میں بیٹھ کر لوزان کانفرنس میں پہنچا تھا؟
> اس نے ہنس کر کہا "جناب یہ سب آپ ہی کی کارروائی تھی" اس کے بعد مولانا نے آیت کے مطلب بیان کئے، تو وہ کہنے لگا واقعی آپ بڑے عالم ہیں، آپ نے مسلمانوں کی ایک بڑی سلطنت (افغانستان) کو آزاد کرایا۔ جزاک اللہ!

پھر اس نے اپنے میزبان احسان اللہ خان سے کہا کہ

> مولانا بڑے عالم ہیں، ایسے لوگ دنیا میں بہت کم پیدا ہوتے ہیں واہ وا، بڑے عالم ہیں بڑے عالم ہیں، وہ بار بار مولانا کی قابلیت کا اعتراف کرتا رہا پھر ایک دو بار حرم مکہ میں بھی بڑے احترام کے ساتھ مولانا سے ملاقات کی۔

عبداللہ یوسف علی خاں نے مسلمانوں کی ایک سلطنت آزاد کرانے کا کریڈٹ مولانا کو دیا ـــ اس سے مراد افغانستان کی آزادی ہے جس پر مولانا کے ایک عزیز شاگرد ظفر حسن ایبک نے اپنی آپ بیتی میں روشنی ڈالی ہے۔

(دیکھیں آپ بیتی حصہ اوّل مطبوعہ لاہور ۱۳۸۷ھ (باب ۴) و مابعد)

انگریز وزیر اعظم کے پرائیویٹ سیکرٹری کے بعد افغانستان کے جشن آزادی میں شریک انگریزی نمائندہ کی سنیں، اس نے اپنی تقریر میں کیا کہا!

"یہ آزادی افغانستان کی نہیں بلکہ مولوی عبید اللہ سندھی کی فتح ہے۔ یعنی دوسرے
لفظوں میں ہندوستان کی فتح ہے۔ (سرگذشت کابل ص۲۰۳)

امیر امان اللہ خان مرحوم نے حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن (جن کے حکم و ارشاد پر مولانا سندھی کابل گئے اور سارا کام کیا) کے جلسہ تعزیت میں کہا:

کارے کہ مولانا محمود حسن شیخ الہند شروع کردہ بود من اورا تمام می کنم (سرگذشت کابل ص۲۰۲)

لوزان کانفرنس جس کا مولانا سندھی نے عبید اللہ یوسف علی سے سوال کیا تھا، بڑے نازک موڑ پر ہوئی برطانیہ کے حلیف بوجوہ ناراض تھے اس لئے عجلت پسندی سے کام لینا پڑا ادھر مولانا کے شاگرد اور تربیت یافتہ جسطرح مختلف محاذوں پر نبرد آزما تھے اس سے آزادی کا راستہ کھل رہا تھا اس راستہ کو بند کرنے کے لئے بھی عجلت کا مظاہرہ انگریز وزیر اعظم نے کیا (تفصیلات آپ بیتی ظفر حسن اور کسی قدر سرگذشت کابل میں ملاحظہ فرمائیے)

مولانا سندھی نے قرآن کی جو خدمت کی اس سے متعلق علامہ موسیٰ جار اللہ کہتے ہیں:

امام سندھی نے اپنی ساری عمر قرآن کریم اور اس کے فلسفہ کے لئے وقف کر دی، وہ قرآن کریم کے فلسفہ کو جیسا کہ اس کے جاننے کا حق ہے، جانتے ہیں اور امام شاہ ولی اللہ دہلوی کے اصول پر جانتے ہیں (مقدمہ تفہیم الہام الرحمٰن مطبوعہ حیدر آباد ص۳-۴)

اور علامہ نے یہ بھی فرمایا کہ:

مولانا سندھی امام، مجاہد اور مجتہد تھے۔

(مقدمہ التمہید ص۷ از مولانا غلام مصطفیٰ قاسمی مطبوعہ حیدر آباد ۱۹۷۶ء)

مولانا سندھی قدس سرہٗ پر بعض حضرات نے آزاد خیالی کا الزام لگایا اور الزام لگاتے ہوئے ذرہ برابر خوف خدا کا احساس نہ کیا ـــــ اصل مسئلہ یہ تھا کہ مولانا سندھی جو فرماتے تھے وہ بہت دور کی بات ہوتی تھی، قدرت نے ان کو جو دیدہ بینا عطا فرمائی تھی اس کے پیش نظر مستقبل میں پیش آنے والے حوادث وہ معلوم کر لیتے تھے نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ وہ مستقبل کے حوادث سے قوم کو محفوظ رکھنے کے لئے بات کہتے یار لوگ الٹا مطلب نکال کر اپنی سی لے اڑتے۔ اس سلسلے میں ایک ندوی فاضل مولانا مسعود عالم ندوی کا نام سب سے زیادہ اہم ہے جنہوں نے مولانا کے افکار پر ستمبر ۴۴ء کے معارف میں ایک تنقیدی مقالہ شائع کرایا۔ گویا مولانا کے لاکھوں معتقدین ان کے حادثہ وفات کے سبب مضطرب و پریشان حال تھے (مولانا کا انتقال اگست ۴۴ء میں

ہوا) تو مسعود صاحب نے اور نمک پاشی کا سامان فراہم کیا۔

مسعود صاحب کی اس تنقید کا جواب مولانا سعید احمد اکبر آبادی نے "برہان" دہلی میں لکھا جس کے وہ ایڈیٹر تھے جس کو بعد میں کتابی شکل میں سندھ ساگر اکادمی لاہور نے ۱۹۶۲ء میں چھاپا اور دیانت داری یہ کی کہ مسعود صاحب کا تنقیدی مقالہ بھی ساتھ شامل کر دیا تاکہ ناظرین دونوں رُخ دیکھ کر مسعود صاحب کی تحریر کا وزن محسوس کر سکیں۔ اس جوابی مقالہ کے دیباچہ میں سرور صاحب لکھتے ہیں کہ:

> مولانا عبید اللہ سندھی مرحوم جن کی شخصیت اور افکار زیر نظر کتاب کا موضوع ہیں سب جانتے ہیں کہ دار العلوم دیوبند کے فارغ التحصیل تھے (دیوبند کے علاوہ) مولانا گنگوہی سے (بھی) انہوں نے حدیث پڑھی تھی اور شیخ الہند کے عزیز ترین شاگردوں میں ان کا شمار ہوتا تھا، مرحوم نے دیوبندی طریقہ پر تعلیم پائی اور اسی طریقے پر ساری عمر طلبہ کو پڑھاتے رہے اور آخر تک دیوبند کی روح اور دیوبندی زندگی کے جو ضروری اعمال و آداب ہیں انکو مرحوم نے برابر ایمان اور مسلک سمجھا۔ (مولانا سندھی اور ان کے ناقد ص۱۴)

مسعود صاحب سے زیادہ افسوس ان کے استاد محترم علامہ سید سلیمان ندوی پر ہے جو کسی زمانہ میں امام الہند مولانا ابوالکلام کے الہلال میں ان کے دست و بازو تھے اور پھر جمعیۃ علماء ہند کے اجلاس کلکتہ ۱۹۲۶ء میں انہوں نے خطبۂ صدارت ارشاد فرمایا۔ اس کے بعد وہ نامعلوم اسباب کی بنا پر اس قافلہ سے الگ راہ بنا کر چلے اور اس تبدیلی کے بعد انہوں نے بھی مولانا سندھی پر تنقید کی

(بحوالہ افادات ص۳۶۵ (مقدمہ مقالہ مسعود عالم صاحب)

خیر یہ ان کا حق تھا۔ افسوس یہ ہے کہ انہوں نے اس معاملہ میں اکابر دیوبند بالخصوص حضرت علامہ سید انور شاہ قدس سرہٗ کا سہارا لینا چاہا ــــ حالانکہ سید صاحب اس حقیقت سے یقیناً باخبر تھے کہ گو ایک وقت میں حضرت شاہ صاحب اور مولانا کا اختلاف ہوا اور اس نے بدمزگی کی صورت اختیار کر لی لیکن شاہ صاحب قدس سرہٗ جیسے عظیم المرتبت اور بلند ظرف انسان کو جونہی احساس ہوا تو مکہ مکرمہ مولانا کو لکھ کر ان سے اپنا معاملہ صاف کیا۔ یہ تفصیلات ذاتی ڈائری ص۲، سرگذشت کابل ص۱۱، افادات و ملفوظات ص۳۶۶ اور حضرت شیخ الاسلام مولانا مدنی قدس سرہ کی نقش حیات ص۱۴۱، ج دوم پر موجود ہیں ــــ مولانا مدنی کے حوالہ سے آخری چند سطریں ملاحظہ فرمائیں۔

حضرت مولانا انور شاہ صاحب مرحوم نے مولانا سندھی کے نام مکہ معظمہ کے قیام کے زمانہ میں پیغام بھیجا تھا کہ قیام دیوبند کے زمانہ میں غلط فہمی کی وجہ سے میں آپ کے لئے تکلیف کا باعث بنا تھا۔ اب میرے دل میں آپ سے کوئی رنج نہیں ہے۔ امید ہے کہ آپ بھی معاف فرمائیں گے۔

اور پھر جب مولانا طویل جلاوطنی کے بعد ۱۹۳۹ء میں واپس تشریف لائے تو ذاتی ڈائری صد ۳۲ اور سرگذشت کابل صد ۱ کے مطابق جن شہروں میں ان کا زبردست خیر مقدم ہوا ان میں دیوبند بھی تھا۔ دیوبند کے مہتمم، اساتذہ، طلبہ سب ہی اپنے اس بزرگ کو لینے گئے، عقیدت و احترام سے ٹھہرایا۔ علمی محافل قائم ہوئیں حتیٰ کہ احقر نے براہ راست مولانا قاری محمد طیب صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ سے سنا کہ مولانا نے اس زمانہ میں ہمیں (یعنی اساتذہ کو) "حجۃ اللہ" پڑھائی۔

بہرحال سید صاحب جیسے بزرگ کے لئے تنقید کا حق تسلیم کرنے کے باوصف ایسا مناسب نہ تھا (اللہ تعالیٰ ان کی خطاؤں سے درگذر فرمائے) ـــــ مسعود صاحب نے اتنی خوفناک تنقید کے باوصف یہ اعتراف بہرحال کیا کہ:

حضرت شاہ صاحب ـــــ (امام ولی اللہؒ) ـــــ کی حکمت کے اصل وارث اور ان کی راہ پر ٹھیک ٹھیک چلنے والے مولانا عبید اللہ سندھی اور ان کے شیوخ (اساتذہ) ہیں ہمیں ان شیوخ کے علم و فضل، تقویٰ و صلاح اور خدمات کا پورا پورا اعتراف ہے

(تنقید مولانا ندوی صد ۶۹ بحوالہ افادات صد ۳۱۲)

مولانا مسعود عالم صاحب ایک طرف نہ صرف مولانا سندھی کے شیوخ و اساتذہ بلکہ خود انہیں بھی شاہ صاحب کی حکمت کا اصل وارث اور ان کی راہ پر ٹھیک ٹھیک چلنے والا فرماتے ہیں دوسری طرف ان کے معتقدات تک کو نقد و نظر کی ترازو میں تول کر انتہا پسندی کا مظاہرہ کرتے ہیں ـــــ ہمارے خیال میں شاہ صاحب جس ظالمانہ اقتصادی نظام کے خلاف قوم کا ذہن بنا گئے تھے مولانا سندھی اس کے شد و مد سے مداح تھے اور عملاً کوشاں جبکہ مسعود صاحب اپنے جاگیرانہ ذوق کے مطابق اس فلسفہ کو پسند نہ کرتے تھے۔ اور شاہ صاحب پر براہ راست حملہ مشکل تھا تو نزلہ بر عضو ضعیف سندھی مرحوم پر گرا (واللہ تعالیٰ اعلم) ـــــ حالانکہ مولانا تو اوّل و آخر اپنے اساتذہ و شیوخ کے افکار پر عمل پیرا تھے۔ خاص طور پر شاہ ولی اللہ کے معاملہ میں ان کے احساسات جو تھے وہ بالکل الم نشرح ہیں ـــــ ایک جگہ فرماتے ہیں:

شاہ ولی اللہ کے فکر میں آفاقی وسعت ہے، عالمگیر انسانیت ہے "ازل سے لے کر اب تک کے تمام فکری، ذہنی اور فلسفیانہ نظاموں کو ایک رشتے میں پرونے کی کوشش کی گئی ہے۔ پھر اس وسعت اور بے کنار ہونے کے باوجود ولی اللّٰہی فکر میں ترتیب ہے، نظم و باقاعدگی ہے۔ گویا کہ یہ ریاضی یا حساب کا کوئی مسئلہ ہے۔

(افادات وملفوظات ص۲۱۷ نومبر ۱۹۷۲ء مطبوعہ لاہور)

ایک دوسری جگہ فرماتے ہیں:

مجھے کسی دوسرے حکیم کا قرار دادہ مضمون سلسلہ کلام الٰہی سے استنباط کرنے کی ضرورت نہیں ہوئی، میں معانی (قرآن) کو شاہ صاحب کی حکمت سے باہر جانے نہیں دیتا، عام مفسرین سے جہاں کہیں اختلاف کروں گا وہ شاہ صاحب کے اصول کے مطابق ہوگا۔ بعض ایسے مواقع ملیں گے کہ میری سند مولانا شاہ عبدالعزیز اور شاہ رفیع الدین اور مولانا محمد اسمٰعیل شہید اور مولانا محمد قاسم کے کلام میں ملے گی۔ شاذ و نادر باتیں ایسی ہوں گی جو خود میرے فکر کا نتیجہ ہیں۔ میں ایسے موقع پر صراحتہً بتادیا کرتا ہوں کہ یہ میری سوچی ہوئی بات ہے اس کا رد و قبول ہر وقت سامع کے اختیار میں ہے مگر جن چیزوں میں ائمہ اور اساتذہ کی سند موجود ہے میرا جی چاہتا ہے کہ اہل علم تناسب آیات میں توجہ کریں اور ان کی تقلید سے ابا (انکار) نہ کریں۔

(الفرقان لکھنو (سابقہ بریلی) کا شاہ ولی اللہ نمبر ص۲۷۰ مقالہ مولانا سندھی مطبوعہ ۱۳۶۰ھ)

اپنے شیخ اکبر جن سے براہ راست استفادہ کیا یعنی شیخ الہند مولانا محمود حسن قدس سرہ ــــ ان کے متعلق فرماتے ہیں:

وہ دن ہے اور آج کا دن حضرت شیخ الہند سے میری یہ وارفتگی قائم ہے۔ میں نے جو کچھ پایا ان سے پایا ان کی ذات سے پایا۔ انہوں نے ہی مولانا محمد قاسم کی راہ دکھائی۔ ان کی بدولت حضرت شاہ ولی اللہ سے عقیدت نصیب ہوئی۔ الغرض جو کچھ میں ہوں سب انہی کی ذات کا فیض ہے۔ (افادات و ملفوظات ص۲۸۵)

سرور صاحب ــــ مرتب ملفوظات، ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم کے حوالہ سے کہتے ہیں کہ وہ راقم الحروف کو اکثر کہا کرتے تھے بلکہ تنبیہہ کے طور پر نصیحت کیا کرتے تھے کہ مولانا (سندھی) کو دیکھو اتنے انقلابی اور اس قدر باغی لیکن اپنے بزرگوں کے اتنے

عقیدت مند (ص ۳۸۵)

جاننے والے جانتے ہیں کہ مولانا نے کابل سے نکلنے کے بعد روس، اٹلی وغیرہ کی سیاحت کی ـــــ روس اس وقت کمیونزم کے انقلاب کا شکار ہو چکا تھا۔ مولانا نے اس صورتِ حال کا بچشم خود مشاہدہ کیا اور سخت ترین حالات سے انہیں گزرنا پڑا لیکن قرآن عزیز پر ان کا لازوال ایمان اور اور ان کی اسلامیت ذرا متاثر نہ ہوئی کیوں؟ اس کا جواب مولانا کی زبان سے سنیں:

میں نے یورپ کا سفر سخت انقلابی حالات میں کیا ہے اور بحمد اللہ شاہ ولی اللہ کے طریقہ پر قرآن دانی اور موطا امام مالک کی فقہ کو مانتا ہوا سالم نکل آیا ہوں۔ یہ میں شاہ صاحب کی تجدید کی بہت بڑی برکت مانتا ہوں۔ کاش اہل علم ادھر توجہ کریں اور نوجوان مسلمان کی مرکزی طاقت (یعنی عربی مدارس اور کالج کے طلبہ) سے ہونہار افراد کو جمع کر کے ایک شیرازے میں باندھ دیں۔ (الفرقان۔ شاہ ولی اللہ نمبر ص ۳۰۲)

مولانا سندھی شاہ ولی اللہ کے معاملہ میں ان خیالات کے بلا وجہ حامل نہ تھے ـــــ واقعی شاہ صاحب ایسے گوہر تابدار تھے جن کی چمک سے ایک دنیا مستفید ہوئی اور ہو رہی ہے۔ حجۃ الاسلام الحکیم الامام محمد قاسم نانوتوی فرماتے تھے کہ:

(شاہ صاحب) ان افرادِ امت میں سے ہیں کہ سرزمینِ ہند میں اگر صرف شاہ ولی اللہ ہی پیدا ہوتے تو ہندوستان کے لیے یہ فخر کافی تھا۔ (الفرقان ص ۳۸۲)

اور اس ضمن میں ایک اور بات علامہ موسیٰ جار اللہ کے حوالہ سے سنتے جائیں جن پر مولانا کی طرح کمیونزم کا پرچارک ہونے کا بہتانِ عظیم ہے۔ مولانا سندھی کے افادات پر مبنی ان کی کتاب "کتاب فی حروف اوائل السور" کا باب ۵ "لا اشتراکیۃ فی الاسلام" کے عنوان سے معنون ہے۔ اس کو پڑھ لیں آپ کو اندازہ ہو جائے گا کہ سندھی مرحوم کتنے پختہ کار مسلمان تھے اور یہ کہ قرآن، حدیث اور شاہ ولی اللہ کے فلسفہ سے ایک قدم باہر نہ رکھتے۔

"اسلام دین توحید ہے جو پیدا کرنے والے کو ایک قرار دیتا ہے اور معبود کی یکتائی کا تصور پیش کرتا ہے۔ اسلام میں نہ تو شرک ہے اور نہ اشتراک۔ اسی طرح اسلام میں اشتراکیت ان معنوں میں نہیں ہے جیسا کہ لوگ مفہوم لیتے ہیں۔ اموال میں اشتراک ایک باطل امید ہے جس میں بنی نوع انسان کے لئے کوئی بھلائی موجود نہیں ہے

اور نہ ہی اس پر کاربند ہونے والے کے لئے کوئی بہتری ہے۔ ملکیت کا انکار اور محصولات میں حق ملکیت کا انکار کسی ایک کے لئے بھی سودمند نہیں اور جو فائدہ کارکن اپنے کام کی بدولت معاشرے کو پہنچاتا ہے وہ اس اجتماعی منفعت کے مقابلہ پر ایک حقیر چیز کی حیثیت رکھتا ہے جو اس کو معاشرے کی طرف سے دستیاب ہوتی ہے۔ یہ وہ عظیم اصول ہے جس سے کارل مارکس کے گروہ کے دیگر اشتراکی غافل ہیں اور خیر کی بہترین عملی شکل سارے معاشرے کی سعادت ہے اور فرد کی سعادت معاشرے کی سعادت ہی میں ہوتی ہے۔ اشفاع اور حقوق کی جملہ اقسام جو معاشرے میں پائی جاتی ہیں اسلام انہیں معاشرے کے مختلف گروہوں اور اس کے افراد کے مابین مشترک قرار دیتا ہے۔

یہ اقتباس کتاب حروف اوائل السور ص ۲۲۸ تا ص ۲۳۲ کے طویل ترین اقتباس کا محض ایک حصہ ہے ۔ آگے چل کر علامہ ان بعض آیات قرآنی مثلاً سورۃ زخرف آیت ۳۲ اور سورۃ شوریٰ آیت ۲۷ وغیرہ کے متعلق مولانا کے افادات کی روشنی میں صحیح مطالب بیان کرتے ہیں اور بعض ان خود غلط عناصر جو کھینچا تانی کرتے ہیں کو جادہ قدیم اور صراط المستقیم کی طرف بلاتے ہیں۔

مولانا سندھی کے نام پر بعض نادان دوست اپنی مرعوبانہ ذہنیت کی جو دکان چمکاتے ہیں ان کے لئے بھی اس میں سرمۂ بصیرت ہے ۔ کاش وہ ایسی حرکات سے اجتناب کرکے روحِ سندھی سے معذرت خواہ ہوں اور قرآن کو اس طرح سمجھنے کی سعی کریں جس طرح مولانا کا اصول تھا ۔۔۔ انہی نادان دوستوں کے سبب مولانا نشانہ ستم بنے ۔۔۔ ان میں ایک صاحب ملتان کے ایک قصبہ سے تعلق رکھتے ہیں جنہوں نے الہام الرحمٰن کی دو ابتدائی جلدیں اس طرح چھاپی ہیں کہ مظلوم سندھی کی روح تڑپ اٹھی ہوگی ۔۔۔ بہرحال دشمنوں اور نادان دوستوں کے سامنے سندھی کا صحیح رخ پیش کرنے کی توفیق اللہ تعالیٰ نے ہمارے محترم دوست ڈاکٹر منیر احمد مغل کو بخشی جو پاکستان عدلیہ کے ایک اہم فرد ہیں لیکن انہوں نے توفیق الٰہی سے سندھ یونیورسٹی میں اپنا مقالہ پیش کیا جو مولانا کی تفسیر "المقام المحمود" پر ان کا ڈاکٹریٹ کا مقالہ ہے ۔۔۔ اس مقالہ کا میٹریل مولانا سندھی کے دیرینہ رفیق و شاگرد مولانا عبداللہ لغاری مرحوم کے نوٹس پر مشتمل ہے جو ان کے محرم راز اور ادارہ تحقیقاتِ اسلامی اسلام آباد کے سابق سربراہ ڈاکٹر عبدالواحد ہالے پوتہ (جو منیر مغل صاحب کے استاذ و نگراں ہیں) کے توسط سے انہیں ملا اور انہوں نے اپنی بہترین صلاحیتیں صرف کرکے اسکو مرتب کر دیا (فجزاھم اللہ تعالیٰ احسن الجزاء)

مولانا سندھی کے خادم و عزیز مولانا عبید اللہ انور نے اس مقالہ کے متعلق یہ سطور قلم بند کیں:

میں نے جناب منیر احمد مغل کے پی ایچ ڈی مقالے کو ذوق و شوق کے ساتھ پڑھا۔ ان کی محنت کی جتنی بھی داد دی جائے کم ہے۔ درحقیقت ڈاکٹر عبدالواحد ہالے پوتہ کی نگرانی میں ڈاکٹر منیر احمد مغل کی کاوشِ فکر نے یہ عظیم کارنامہ انجام دیا۔ مستقبل میں مولانا سندھی پر مزید کام کی پوری توقع کی جاسکتی ہے۔ اس وقت یہ مقالہ ماخذ اور کتاب حوالہ کا کام دے گا۔ بہرحال میں تو اس کے ایک ایک لفظ کو دل کی گہرائیوں سے سراہتا ہوں۔ خود حضرت سندھیؒ نے فرمایا تھا کہ نوجوان جب اس طرف متوجہ ہوں گے تو تو ہمارے اس فکر کی بنیاد پر ایک ہسٹاریکل لاج قائم کردیں گے۔ مجھے تو اس مقالے کی صورت میں حضرت مولانا سندھی کی دعا کی قبولیت آنکھوں سے نظر آرہی ہے۔ کچھ مقامات پر میں نے الفاظ درست کئے ہیں جو ضروری تھے اور مولانا سندھی کے وقت وفات پر ایک نوٹ بھی لکھا ہے کیونکہ میں عینی شاہد تھا۔ میری دعا ہے کہ جن جن حضرات نے اس اہم مقالہ کی تیاری میں حصہ لیا ہے اللہ تعالیٰ انہیں دنیا و آخرت کے بہترین اجر سے سرفراز فرمائے۔ انہوں نے واقعتہً اپنی آخرت سنوار لی ہے:

؎ ایں کار از تو آید و مرداں چنیں کنند

مولانا عبید اللہ لغاری مرحوم جن کے نوٹس کی بنیاد پر یہ عظیم الشان مقالہ مرتب ہوا۔ وہ ۱۹۰۷ء میں داد لغاری نامی گاؤں میں پیدا ہوئے تحصیل میرپور ماتھیلو میں واقع ہے۔ ان کے اساتذہ میں حضرت شیخ الہند کے مجاہد شاگرد مولانا محمد صادق کراچوی کے والد مولانا محمد عبداللہ اور ملتان کے مشہور محدث مولانا سلطان محمود بھی تھے۔ ۱۸۹۸ء میں ان کی شادی ہوئی اور اس سے متصل ہی امروٹ شریف ضلع سکھر میں مولانا سندھی سے ان کی ملاقات ہوئی ــــ امروٹ شریف اعلیٰ حضرت بھرچونڈی رحمہ اللہ تعالیٰ کے خلیفہ حضرت الشیخ تاج محمود قدس سرہ کا مسکن تھا جو شیخ الہند کی تحریک آزادی کے اہم ترین قائدین میں سے تھے اور حضرت بھرچونڈی کے بعد مولانا سندھی کے مربی و سرپرست ــــ حضرت مولانا احمد علی لاہوری کو انہی سے پہلے اجازت ہوئی ان کے سوانح نگار کہتے ہیں کہ اسی ملاقات میں وہ مولانا سندھی کے ہم دم و رفیق بن گئے اور پھر مرتے وقت تک یہ تعلق نبھایا (رحمہ اللہ تعالیٰ)۔ امروٹ شریف کا مدرسہ وہاں پریس کا اہتمام اور "ہدایت الاخوان" کا اجراء اس کے بعد گوٹھ پیر جھنڈا میں دارالرشاد کے نام سے مدرسہ بنانا جس میں وہاں کے شیوخ کی سرپرستی شامل تھی، ان تمام

معاملات میں وہ مولانا سندھی کے دست راست تھے بلکہ گوٹھ کے مدرسہ کے مہتمم وہی تھے۔ سات سال تک اس مدرسہ میں خدمت کے بعد حضرت شیخ الہند کے طلب کرنے پر جب مولانا سندھی اور مولانا محمد صادق (مدرسہ مظہر العلوم کھڈہ کراچی) دیوبند گئے تو یہ بھی ساتھ تھے اور پوری طرح متاثر ہو کر پلٹے۔ ۱۹۱۵ء میں یہ بھی کابل تشریف لے گئے اور مولانا سندھی کے دست و بازو بنے۔ دو سال بعد مولانا سندھی نے ان کے ذریعہ خطوط ہندوستان بھجوائے۔ یہ خطوط مولانا کے اپنے تھے اور بعض راجہ مہندر پرتاب کے۔ انہیں ہندوستان میں مولانا محمد علی جوہر، ڈاکٹر انصاری اور حکیم اجمل خاں وغیرہ کو پہنچانا تھا۔ نیز ایک عبارت ان کے سپرد کردی جس کا مقصد جہاد کی اجازت تھا اور اس پر دین پور شریف، امروٹ شریف اور پیر جھنڈا کے مشائخ سے دستخط لینا تھے۔ مولانا لغاری نے کمال درجہ محنت و دیانت سے دونوں کام کئے اور ان مشائخ کی اجازت لے کر وہ تحریر سردار عبدالرزاق کو کابل روانہ کردی۔ ریشمی خطوط کے قصہ میں دوسرے اکابر و اعیان کے ساتھ یہ بھی اپنے چند رفقا سمیت گرفتار ہو گئے۔ باقی رفقا ان کے سبب رہا ہوئے ——— لیکن مولانا دو سال تک لاہور، پٹھان کوٹ، دین پور اور کراچی وغیرہ نظر بند رہے۔ پہلی جنگ عظیم کے اختتام پر انہیں رہائی ملی اور جب امیر امان اللہ خان انگریز سے بھڑ گئے تو یہ مولانا سندھی کے تعلق کے سبب جو اس لڑائی کے محرک تھے، نظر بند کر دیئے گئے۔ ۱۳۴۵ھ ۱۹۲۶ء میں مولانا سندھی مکہ معظمہ تشریف لے گئے۔ چندے بعد مولانا لغاری وہاں پہنچے۔ تفسیر قرآن، علوم اسلامیہ اور فلسفہ ولی اللہی پر امام سندھی کی جملہ تقریریں مولانا نے نوٹ کیں ——— پختہ کار عالم تھے۔ مولانا کے زندگی بھر کے رفیق تھے۔ مزاج شناس تھے اس لئے ان کی لکھی ہوئی تقریریں ہر طرح معتبر اور مستند قرار پائیں ——— آپ کے سوانح نگاروں کا کہنا ہے کہ اب تک مولانا سندھی کے افکار اور شاہ صاحب کے فلسفہ سے متعلق مستند کتابیں جو شائع ہوئی ہیں تو ان کا مواد مرحوم لغاری کا ہی فراہم کردہ ہے۔ ۱۹۳۹ء میں مولانا سندھی کی واپسی سے کچھ قبل انتظامات کی خاطر واپس آئے اور آخر تک مولانا سندھی کے ساتھ رہے۔ مولانا سندھی کی وفات کے بعد چھ سال تک سندھ یونیورسٹی کے بعض اساتذہ اور شاگردوں کو قرآن کی تفسیر و حکمت پڑھانے کی غرض سے ڈاکٹر نبی بخش بلوچ ڈائریکٹر قومی ادارہ برائے تحقیق تاریخ و ثقافت اسلام آباد اور ڈاکٹر عبدالواحد ہالیپوتہ سابق ڈائریکٹر ادارہ تحقیقات اسلامی اسلام آباد کے یہاں مقیم رہے۔ آخر میں علامہ آئی آئی قاضی صاحب کی علم و معارف پروری کے سبب اعزازی وظیفہ پر سندھ

یونیورسٹی کے ایم اے کے طلبہ کو تفسیر قرآن پڑھانے پر مقرر ہوئے ۱۲ ستمبر ۱۳۵۸ھ کو اچانک پیشاب کی تکلیف ہوئی۔ ۱۵ ستمبر کو سول ہسپتال حیدرآباد میں داخل ہوئے۔ ۱۷ ستمبر آپریشن ہوا۔ اس دن حافظ محمد صاحب سے فرمایا: ہر دمے چند خوردیم و گفتیم وبس ـــ اور اسی سے متصل رات گیارہ بجے اللہ کو پیارے ہوگئے۔ ان کے عزیز فیض یافتہ اور میزبان ڈاکٹر ہالے پوتہ جاپان کے سفر پر تھے ان کی بیگم صاحبہ نے غسل وغیرہ کا اہتمام کیا اور علم وحریت کا یہ گوہر شب چراغ سانگھڑ میں دفن کر دیا گیا ـــ رحمہ اللہ تعالیٰ

(بحوالہ سرگزشت کابل ص ۲۶۲/۶۴ تلخیص و مقالہ قلمی ڈاکٹر مغل صاحب ص ۲۸)

ڈاکٹر عبد الواحد صاحب ہالے پوتہ جو اس مقالہ میں منیر مغل صاحب کے سرپرست ونگراں تھے ان کے بقول مولانا سندھی نے ابتدائے قیام دہلی کے دوران پہلی جنگ عظیم سے قبل جو تفسیر مرتب کی تھی اس کی نقلیں سندھ یونیورسٹی وغیرہ میں موجود ہیں لیکن یہ تفسیر جو اب سامنے ہے یہ اس سے بہت بعد کی ہے جب مولانا کا علم، مشاہدہ، تجربہ سب کچھ حدِ کمال کو پہنچ چکا تھا۔ اور پھر البلد الامین کا قیام اس پر مستزاد، جو سرزمین وحی ہونے کے ناطے سے قدرت کی جلوہ آفرینیوں کی آماجگاہ ہے۔ بقول ڈاکٹر صاحب مولانا نے زندگی کے ادق ترین اور جدید ترین مسائل کے حل کے لئے قرآنِ عزیز کا سہارا لیا اور حکمتِ ولی اللّٰہی کو بنیاد بنایا اور رحمہ اللہ وہ اس میں خوب کامیاب ہوئے۔

(تفصیلات پیش لفظ المقام المحمود پارہ عم ۱۹۵۹ء مطبوعہ حیدرآباد سندھ میں دیکھیں)

مولانا سندھی قرآن عزیز کا جس طرح تعارف کراتے ہیں اس کی تفصیلات تو اصل مقالہ میں ملیں گی نمونہ کے طور پر دیکھیں کہ مولانا اسے انقلابی کتاب فرماتے ہیں جس پر عمل کا نتیجہ تقویٰ ہے ـــ یہی متقی دنیا میں نظامِ سلطنت کے وارث ہوتے ہیں ـــ اور اس سے انکار کا نتیجہ دنیا میں ذلّت اور آخرت میں نارِ جہنم ہے۔ اس کی مثل کوئی پروگرام نہیں اور نہ کوئی اس کی مثال لانے میں کامیاب ہو سکتا ہے ـــ الغرض ایک ایک لفظ قرآن عزیز کی آیات کی ترجمانی کرتا نظر آئے گا اور شاہ ولی اللہ قدس سرہٗ کے انداز کے مطابق یہاں نفسِ قرآن کو سمجھانے کی کوشش ہوگی جسے افسوس کہ نظر انداز کر کے تفسیری مباحث کو اہمیت دے دی گئی ہے ـــ حالانکہ اہمیت متن ونفسِ قرآن کو ہے اور تفسیری مباحث ثانوی حیثیت رکھتے ہیں ـــ فاضل مقالہ نگار نے ص ۱۱ × ۷ (غیر مطبوعہ) سے چند صفحات پر سندھی مرحوم کے حوالہ سے قرآن کا تعارف کرایا ہے جس کی چند سطور ہم نے محض تمثیلاً عرض کر دیں اور پھر ص ۱۱ × ۷ پر ممتاز تفسیری نکات کا ایک نمونہ دکھایا گیا ہے۔ مثلاً عبادت و

استعانت کی شرح کرتے ہوئے فرماتے ہیں (الفاتحہ کی آیت اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَاِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ)

ہم نے تمام کائنات کو دیکھا اور اس سے اندازہ لگایا کہ اس تمام نظامِ عالم کے اوپر ایک ذات ہے ہم اپنا سرِ نیاز اس کے آگے خم کرتے ہیں کیونکہ وہ ہمارا مالک اور کارساز ہے اور اسی سے ہم مدد مانگتے ہیں۔ یہ بڑی بڑی قومیں جس قدر دنیا میں ہیں انہوں نے انسانوں پر ظلم و تشدد کر کے انسانی حقوق کو غصب کر لیا اور انسانوں سے اپنی بندگی کرانے لگے ۔۔۔ اے اللہ ہم ان سے بیزار ہیں اور اب تجھی سے مدد مانگتے ہیں ۔

فاضل مقالہ نگار نے ص۱۱۱ سے ص۱۱۷ (چار صفحات) تک میں یہ بتلایا ہے کہ مولانا لغاری کا مسودہ ڈاکٹر ہالی پوتہ صاحب کے پاس ہے۔ اس کی مائیکروفلم اور فوٹوسٹیٹ ادارہ تحقیقات اسلامی اسلام آباد میں عکسیات ۲۷۷ پر موجود ہے۔ سات جلدیں ۹۷۵ عام رجسٹر سائز کے اوراق پر مشتمل ہیں۔ جلد اوّل بنام المقام المحمود فی تفسیر کتاب اللہ الودود الملقب بمواقف المسترشدین ہے جس کے ۱۲۲ اوراق ہیں۔ الفاتحہ، البقرہ، آل عمران، النساء اور المائدہ اس میں شامل ہیں۔ الفاتحہ کی تفسیر پھر مولانا سندھی نے خود سنی۔ بقول مولانا لغاری الفاتحہ کی تفسیر ۱۱ ذوالقعدہ ۱۳۵۳ھ مطابق ۱۶ فروری ۱۹۳۵ء کو ختم کی۔ البقرہ سے توبہ کے اختتام تک تفصیل نہیں لکھی لیکن یونس سے الناس تک مولانا سندھی کا سننا ثابت ہے اور البقرہ سے توبہ تک فیروز نامی ایک صاحب نے تفسیر مولانا سندھی سے سن کر لکھی تھی۔ مولانا لغاری نے استاد محترم کے حکم سے اس سے نقل لے لی ۔۔۔ !!

دوسری جلد کا نام المقام المحمود فی تفسیر کتاب اللہ الودود الملقب بہ سبیل الرشاد ہے۔ اس کے ۲۹۶ اوراق ہیں۔ سورۃ الانعام سے التوبہ تک یہ مشتمل ہے۔

جلد سوم کا الگ کوئی لقب نہیں اس کے محض ۳۶ اوراق ہیں اور اس میں صرف سورۂ یونس ہے۔ ۲ شعبان ۱۳۵۳ھ مطابق ۲۹ نومبر ۱۹۳۴ء کی تاریخ اس پہ درج ہے۔

جلد چہارم کا بھی کوئی لقب نہیں اس کے ۱۵۵ اوراق ہیں۔ سورۂ ہود سے طٰہٰ تک سورتیں اس میں ہیں۔

جلد پنجم بھی بغیر لقب ہے۔ اس کے اوراق ۱۵۶ سے شروع ہو کر ۲۵۹ تک جاتے ہیں اور یہ الاحزاب پہ ختم ہوتی ہے۔

جلد ششم کا نام المقام المحمود فی تفسیر کتاب اللہ الودود الملقب بالبیّنات ہے۔ ۱۱۹ اوراق

میں الحجرات تک چلی گئی ہے۔

جلد ہفتم کا لقب نہیں لکھا۔ صفحات ۱۲۰ سے شروع ہوتے ہیں اور ۲۶۲ تک جاتے ہیں۔ اس میں سورہ ق سے الناس تک کی تفسیر ہے ـــــ اور اصل مسودہ کے لئے مقالہ نگار نے "م م" کا اشاریہ دیا ہے۔ یعنی المقام المحمود اور جہاں مولانا سندھی نے حدیث کے حوالے دیئے تھے پورا حوالہ تلاش کے بعد درج کیا گیا ہے۔ اسی طرح تاریخی کتب وغیرہ کے حوالے نقل ہو گئے ہیں۔ علامہ موسیٰ جار اللہ کو املا کرائی جانے والی تفسیر الہام الرحمٰن سے تقابلی مطالعہ کے ساتھ اگر کہیں دوسری جگہ کوئی تائیدی چیز ملی ہے تو اسے بھی مقالہ نگار نے درج کر دیا ہے۔ اور شاہ ولی اللہ کی کتب سے بطور خاص تائیدی کلمات نقل کئے گئے ہیں ـــ بقول فاضل مقالہ نگار مولانا سندھی کے سیکرٹری مولانا بشیر احمد لودھیانوی کے پاس جو املی کے ذخیرے تھے وہ ان کے بعد مولانا مقبول عالم مرحوم سیکرٹری شاہ ولی اللہ سوسائٹی لاہور کے پاس منتقل ہوئے۔ انہیں نہ صرف املی پر عبور تھا بلکہ وہ مولانا احمد علی لاہوری رحمہ اللہ تعالیٰ کے خاص شاگرد تھے۔ ایک ابتدائی حصہ حرف بحرف انہوں نے سنا پھر ان کا انتقال ہو گیا۔ رحمہ اللہ تعالیٰ ـــــ انگریزی ترجمہ کی ضرورت مولانا عبدالماجد دریا آبادی کے ترجمہ سے اور اردو ترجمہ کی ضرورت حضرت شیخ الہند کے ترجمہ سے پوری کی گئی ـــــ یہ تفصیلات کا خلاصہ ہے جس سے فاضل مقالہ نگار کی محنت کا اندازہ ہوتا ہے (جزاھم اللہ تعالیٰ)

جیسا کہ ہم نے ابتدا میں بھی کہیں عرض کیا مولانا سندھی کے پیش نظر قوم کے نوجوان طبقہ کو قرآن سے روشناس کرانا تھا۔ یہ بات شاہ ولی اللہ کے افکار سے انہوں نے سیکھی تھی ـــ بقول مولانا عبدالماجد دریا آبادی مرحوم:

> ہندوستان میں یہ قرآن فہمی کا چرچا آج جو کچھ نظر آتا ہے اور یہ اردو، انگریزی اور دوسری زبانوں میں جو بیسیوں ترجمے شائع ہو چکے ہیں، شائع ہو رہے ہیں یا آئندہ شائع ہوں گے ان کے اجر کا جزو اعظم حضرت شاہ صاحب کے حسنات میں لکھا جائے گا۔ یہ سارے چراغ اسی چراغ سے روشن ہوئے۔ (الفرقان ص۳)

مولانا سندھی یہی کچھ کرنا چاہتے تھے اور جیسا کہ آپ پڑھ چکے ابتدائے قیام دہلی سے لے کر قیام مکہ معظمہ تک ان کا محبوب مشغلہ اسی کتاب مقدس پر غور کرنا تھا اور اس کے علوم کی اشاعت۔ مکہ معظمہ سے واپسی کے بعد یہ سودا برابر سمایا رہا بلکہ اس میں اضافہ ہوا ـــ واپسی کے بعد کی ایک تحریر:

ملاحظہ فرمائیں۔

ان حالات میں قرآن کے لئے ضروری تھا کہ اپنے بین الاقوامی انقلاب — کو روشناس کرانے کے لئے کسی ایسے فکر کو عنوان بناتا جو تمام اقوام میں معروف ہوتا — اور پھر بقول مولانا سندھی یہ فکر فکرِ قیامت تھا جس کا مطلب کائنات کا ایک روز منتشر ہونا اور انسانی اعمال کی باز پرس ہونا ہے۔ اس لئے اس مسلّم اور معروف عنوان کا قرآن نے سہارا لیا۔ (دستورِ انقلاب ص۲۹ مطبوعہ لاہور)

اور پھر مولانا خاص واقعات کے حوالے سے قرآن کی تفسیر کو بالکل نادرست سمجھتے تھے اور اس معاملے میں حضرت شاہ ولی اللہ کی الفوز الکبیر کو بنیاد بناتے ہیں اور زور دیتے ہیں کہ قرآن کی تفسیر اس طرح کرو کہ اس کی آیات کسی خاص فرد یا واقعہ سے متعلق ہو کر نہ رہ جائیں ورنہ اس سے اس کی عالمگیریت اور جامعیت متاثر ہوگی (دستور ص۳۱)

(اس کی مزید تفصیلات مولانا سندھی کے مقالہ مطبوعہ الفرقان ص۲۵۶-۲۵۹ پر ملاحظہ فرمائیں)

مولانا مرحوم جیسا کہ پہلے اشارہ ہوا قرآن کو انقلابی کتاب کہہ کر اس پر عمل کا نتیجہ تقویٰ قرار دیتے ہیں ان متقین کو وارث ارضی سمجھتے ہیں جیسا کہ سورۃ النور اور الانبیاء میں ہے اور اس کے لئے وہ لوگوں کو توجہ دلاتے ہیں کہ حضرت شاہ ولی اللہ کی حجۃ اللہ البالغہ کا باب الحاجۃ الی دین ینسخ الادیان اور ازالۃ الخفا میں آیت کریمہ "ھُوَ الَّذِیْ اَرْسَلَ رَسُوْلَہٗ بِالْھُدٰی وَدِیْنِ الْحَقِّ" کی تفسیر پڑھیں۔ (الفرقان ص۲۷۳)

محمودیہ کے ص۱۳ اور ص۱۴ کے مطابق مولانا نے حجازِ مقدس سے واپسی پر اپنا محبوب علمی مشغلہ فلسفہ ولی اللّٰہی کی تعلیم قرار دیا اور ۱۹۳۹ء کے ایک خطبہ صدارت (اجلاس جمعیۃ العلماء ہند بنگال) میں اس پر پورے شدّ ومد سے زور دیا — شاہ صاحب سے مولانا کی دلچسپی کا راز کوئی راز نہیں ایک حقیقت ہے اور اس کا سبب محض یہ ہے کہ شاہ صاحب نے ظلمت کدہ ہند میں لوگوں کو قرآن کی طرف رجوع کی دعوت دی اور سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے الفاظ میں گویا فرمایا:

بھٹکنے سے کیا فائدہ؟ اصلاح مطلوب ہے تو قرآن کی طرف آؤ (مفہوم۔ الموطا)

اس دلچسپی نے مولانا کو اس مقام پر لا کھڑا کیا کہ بقول مولانا نور الحق العلوی مرحوم (جو مولانا کے بہت عزیز شاگرد تھے) مولانا سندھی کو شاہ صاحب کی کتابیں ازبر ہو چکی تھیں اور یا پھر قوتِ حدس نے

ایسی ترقی کرلی تھی کہ ان کے لئے شاہ صاحب سے اخذ کرنا مشکل نہ تھا۔

فاضل مقالہ نگار نے چند صفحات میں جن کی ابتداء صدے سے ہوتی ہے حکومت اور دوسرے متعلقہ مسائل پر مولانا کے افکار قلم بند کر دیئے ہیں جن کو پڑھ کر آج کی الجھنوں کا حل آسان ہو جاتا ہے ـــــ آج دنیا نظام حکومت کے معاملے میں اور حالات کی اصلاح کے معاملہ میں ازحد پریشان ہے اور جیب و داماں اس طرح الجھ گئے ہیں کہ بات بنتی ہی نہیں ـــــ مولانا قرآن کی روشنی میں گھر کے نظام سے چلتے ہیں اور عالمگیر انسانیت تک پہنچ کر دم لیتے ہیں کہ کس طرح اللہ تعالیٰ نے درجہ بدرجہ انسان کو حکومت عادلہ کا ڈھنگ سکھایا ہے ـــــ انشاء اللہ چند بعد یہ تفسیر چھپ کر سامنے آئے گی تو ایک دنیا کو اندازہ ہو سکے گا کہ ایک بوریا نشین نے کیا کام کیا ـــــ بلاشبہ اس سعادت کا سہرا ڈاکٹر ہالی پوتہ اور ان کے شاگرد عزیز منیر صاحب کے سر ہے جنہوں نے اس کو ایڈٹ کیا۔ سالوں کی محنت اور اس طرح کہ بقول منیر صاحب ایک ایک آیت پر بسا اوقات کئی کئی راتیں سوچنا پڑا اور استاذ محترم ہالی پوتہ صاحب اکثر اوقات اشکال کا حل یوں تلاش کرتے کہ دو نفل پڑھواتے اور روح سندھی کو ہدیہ کراتے پھر قرآن لے کر بیٹھ جاتے اور الحمد للہ معاملہ صاف ہو جاتا۔

اس تمام تر محنت کے باوجود اختلاف کی گنجائش باقی رہ جاتی ہے اور یہ فطری امر ہے۔ اور بقول نبی اکرم علیہ السلام ـــــ رحمت ـــــ لیکن ضروری یہ ہے کہ پوری طرح اس نسخہ کیمیا کو پڑھا جائے اور بار بار پڑھا جائے ـــــ مولانا محمد منظور نعمانی الفرقان کے شاہ ولی اللہ نمبر میں مولانا سندھی کے مقالہ کی تمہید میں فرماتے ہیں اور علماء کو توجہ دلاتے ہیں کہ حوصلہ سے سنھبل کر بار بار پڑھیں پھر فیصلہ کریں ـــــ اپنا کہتے ہیں کہ بعض مقامات مجھے بار بار پڑھنا پڑے (صہ ۲۵)۔ مطالعہ سے قبل ہی کسی ذہنی یا جماعتی سانچہ پر مولانا کو فٹ کر کے ان کے افکار کا مطالعہ ان کے ساتھ انصاف نہیں وہ اوّل آخر مسلمان تھے ـــــ ایک مخلص، اکل کھرے اور سچے مسلمان ـــــ اس اعتبار سے انہیں پڑھیں اور مواقع اختلاف پر حکیم دہلوی قدس سرہٗ کا ذوق و مسلک اپنائیں۔ شاہ صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ اہل علم کے لئے اختلاف کی حدود پر بحث میں فرماتے ہیں:

> جو بات کتاب اللہ کی کسی آیت یا رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ واصحابہ وسلم کی سنتِ قائمہ یا قرون مشہود لہا بالخیر کے اجماع یا جمہور مجتہدین اور معظم سواد المسلمین

کے مسلک مختار کے خلاف ہو میں اس سے بری اور بیزار ہوں۔ پس اگر ایسی کوئی بات نکل جائے تو وہ یقیناً خطا اور چوک کا نتیجہ ہے، اللہ تعالیٰ کی رحمت ہو اس پر جو ہم کو خبردار اور غفلت سے متنبہ کرے۔ لیکن یہ بعد کے مصنفین جن کا کام ائمہ متقدمین کے کلام سے تخریج اور استنباط ہے اور بحث و مجادلہ جن کا شیوہ ہے ضروری نہیں ہے کہ ان کی تمام باتوں سے ہم اتفاق ہی کریں ـــــ وہ بھی انسان ہیں اور ہم بھی انسان۔ اور ہمارا ان کا معاملہ قریباً برابر سرابر ہی ہے۔

(حجۃ اللہ البالغہ (عربی) صہ ۹)

گویا فلاں اور فلاں کے حوالے سے امام سندھی پر تنقید مناسب نہیں انہیں اور ان کے افکار کو قرآن و سنت کی کسوٹی پر پرکھیں ـــــ رہ گئے فلاں اور فلاں تو وہ بھی مولانا سندھی کی طرح انسان تھے اور بس۔ اگر ان کی علمی تحقیقات میں غلطی کا احتمال ہے تو اُن کی تحقیقات بھی منزہ عن الخطا نہیں۔ اسی طرح شاہ صاحب اپنے مکتوبات میں صہ ۲۷، ۲۸ پر شیخ ابن عربی اور حضرت مجدد سرہندی قدس سرہما کے متعلق لکھتے ہیں کہ:

ہمارا اعتقاد یہ ہے کہ یہ دونوں خدا کے برگزیدہ بندوں میں سے ہیں اور ان پر جو اعتراضات کئے جاتے ہیں ہم ان کی طرف کوئی التفات نہیں کرتے اور یہی حال ہمارے نزدیک علامہ ابن تیمیہ کا ہے۔

شیخ ابن عربی اور حضرت مجدد وحدۃ الوجود اور وحدۃ الشہود کے معاملہ میں جس طرح مختلف الرائے ہیں اس کا اہل علم کو پتہ ہے ـــــ لیکن یہ کیا ضروری ہے کہ علمی اختلافات کی بنیاد پر کسی پر کیچڑ اچھالا جائے ـــــ اللہ تعالیٰ اس سے ہمیں بچائے ـــــ

اور پھر بقول حضرت شیخ الاسلام مولانا مدنی قدس سرہ یہ بھی ذہن میں رکھیں کہ مولانا سندھی جیسا ذہین و فطین انسان جو کفر کی گود سے نکل کر اسلام کی آغوش میں آیا اور ساری عمر حضور نبی مکرم علیہ السلام کے حوالے سے آنی والی سچائی اور کلمہ حق بلند کرنے کے لئے سرگرم عمل رہا، اسے اس راستہ میں کن کن مصائب سے دوچار نہیں ہونا پڑا، ان صدمات کے نتیجہ میں تو انسان کی دماغی شریان پھٹ جائے تو عجب نہیں اور وہ اپنے عقیدہ و مسلک سے منحرف ہو کر کسی دوسرے راستہ پر چل نکلے تو تعجب نہ ہو لیکن مرحوم سندھی نے اپنا سب کچھ قربان کر کے جس اسلام کو سینہ سے لگایا تھا دم واپسیں تک اسے سینہ سے لگائے رہے اور ؎ "الا حدیث یار کہ تکرار می کنیم" کے مصداق قرآن و سنت نبوی کے مبلغ و داعی کی حیثیت

سے عمر عزیز بسر کر دی ــــ ذہنی صدمات کے سبب ان کے خیالات میں کسی وقت بے ترتیبی کا امکان موجود ہے جس کا اعتراف اس عبقری اور رشد دماغ نے خود کیا ــــ ملفوظات ص ۲۲۵ پر ہے:

میں مانتا ہوں کہ بعض اوقات میں اپنے مطلب کی صاف تعبیر نہیں کر پاتا اور اس سے سننے والوں کو غلط فہمیاں پیدا ہوتی ہیں میں اس معاملہ میں معذور ہوں ــــ آپ نے خاص طور پر ذاکر صاحب (ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم شیخ الجامعہ جامعہ ملیہ دہلی بعدہ صدر ہند) کو مخاطب کیا اور کہا

ڈاکٹر صاحب میں جن مایوسیوں، ناکامیوں اور پریشانیوں سے گزرا ہوں اور اس یقین تک کہ ہندوستانی مسلمان اس ملک میں سربلند ہو سکتے ہیں! اس یقین تک پہنچنے میں مجھے جن مصائب سے سابقہ پڑا ہے میں ان کا خیال کرتا ہوں تو مجھے تعجب ہوتا ہے کہ میں کس طرح اس یقین تک پہنچ سکا میں اس پر خدا کا شکر ادا کرتا ہوں کہ مجھے جامعہ میں جگہ مل گئی اور آپ جیسے سننے اور سمجھنے والے حضرات میسر آگئے۔

ان صدمات، مایوسیوں اور مشکلات کے باوجود وہ روس کے کفرزار سے سلامتی کے ساتھ نکلا تو اسے وہ شاہ ولی اللہ کی تجدید کی برکت سمجھتا ہے اور ہمارے خیال میں اس نے اس سب کے باوجود قرآن فہمی کی طرف لوگوں کو توجہ دلائی تو یہ قرآن کی برکت اور صاحب وحی کا زندہ معجزہ ہے ورنہ بقول مولانا مدنی مرحوم اس مقام پر تو سنبھلنا مشکل ہو جاتا ہے۔ (اس ضمن میں حضرت مدنی کے ارشادات ذاتی ڈائری ص ۱۷۱ سے ص ۵ تک کی تفصیلات بڑی نفع بخش ہیں)

ہمارے بعض کرم فرما قادیانیوں کے مسئلہ میں بھی انہیں متہم گردانتے ہیں کہ وہ نرم گوشہ رکھتے تھے ــــ ان اکابر اور عزیزوں کو ملفوظات کا ص ۲۹۷ دیکھنا ضروری ہے جہاں حاشیہ پر حضرت شیخ الہند کے شاگرد علامہ شہاب الدین رحمہ اللہ تعالیٰ کے حوالہ سے ایک روایت نقل ہے کہ مولانا سندھی کا ایک شاگرد بدقسمتی سے قادیانی ہو گیا۔ مولانا اس سے قادیان میں ملے۔ بات ہوئی تو وہ واہی تباہی بکنے لگا۔ مولانا نے اس سے کہا کہ تم آگے تک ہمیں پہنچا آؤ۔ وہ ساتھ ہو لیا۔ گاؤں سے باہر نکلے تو مولانا نے مجھے ذرا الگ کر کے اس سے بات کی۔ حتیٰ کہ وہ قادیانیت سے تائب ہو گیا اور درخواست کی کہ مجھے اجازت دیں تاکہ میں سامان لا سکوں اور آپ کے ہمراہ چلوں۔ مولانا نے اسے سامان چھوڑ دینے پر راضی کر لیا اور اسے کفرزار قادیاں سے نکال لائے۔

ایسے بیدار مغز اور بہی خواہِ اسلام کی تفسیر کا مطالعہ ٹھنڈے دل و دماغ سے کرنا ضروری ہے

تاکہ قرآنی حکمت سے صحیح آگاہی ہوسکے۔

ہمارا خیال تھا کہ اس مقالہ میں مولاناؒ کی سیاسی سوچ وافکار اور ان کی حریت مآبی کا بھی کسی قدر تفصیل سے ذکر کردیں لیکن طوالت کے سبب اس قصہّ کو دوسرے موقعہ پر اٹھا رکھتے ہیں اور محض اتنے اشارات پر اکتفا کرتے ہیں کہ جس افغانستان کا مسلمان آج آپس میں دست وگریباں ہے اور جن کی ہجرت وجہاد پر کئی سیاسی بدذوق مال بٹور رہے ہیں ـــــ اس افغانستان کے استحکام کا سہرا مولانا کے سر ہے جیسا کہ آپ پڑھ چکے ہیں

مزید یہ ذہن میں رکھیں کہ روسی حملہ سے افغانستان کو بچانا مولانا کا کارنامہ ہے (دیکھیں مقالہ منیر مغل صاحب صـ۱۱۱×× اور آپ بیتی ظفرحسن حصہّ اوّل)

دوسرے یہ بات ذہن میں رکھیں کہ مولانا المحترم نے ۱۹۲۵ء میں ترکی سے وفاقی ہند کا دستور تیار کیا اور استنبول سے اسے شائع بھی کیا نتیجہ یہ ہوا کہ ہندوستان کے لیے سیکرٹری آف سٹیٹ مسٹر لارڈ بیڈبرکن کو ڈرامائی طور پر برطانوی پالیسی کا اعلان کرنا پڑا۔ (مقالہ منیر صاحب صـ۱۱۱×)

اس سلسلہ کی مزید تفصیلات ظفرحسن ایبک کی آپ بیتی کے حصّہ دوم کے باب۱۱ میں بطور خاص موجود ہیں ـــــ اس پروگرام میں ہندوستان کی آزادی ـــ اور آزادی کے بعد اس میں وفاقی حکومت کا قیام (جس کو آج ہمارے یہاں کامیاب ترین حکومت سمجھا جارہا ہے ـــــ یہ ایک بوریا نشین کی سوچ ہے) مسلمانوں اور دوسری اقلیتوں کے حقوق کی محافظت۔ اکثریت رکھنے والے محنت کش طبقہ کی حکومت کا قیام اور امپریلزم کے توڑ کے لیے ایشیائی فیڈریشن کا قیام شامل تھا۔

(آپ بیتی صـ۱۰۲۔۱۰۱، ج دوم)

محنت کش طبقہ کی حکومت کے ضمن میں مولانا نے لکھا:

"زمینداری اور سرمایہ داری کو ختم کرنا تاکہ لوگ کمیونزم کے سبز باغ دیکھ کر دھوکہ نہ کھائیں"

اگر یہ بات تسلیم ہوجاتی تو آج روس کا خوف ہمارے سروں پر مسلّط نہ ہوتا اور ایشیائی سوسائٹی بن جانے سے ہم برطانوی امپریلزم کے بعد امریکی سامراج کی گود میں نہ ہوتے۔ اور روس وچین کی بالادستی کے بجائے قیادت ہمارے ہاتھ میں ہوتی۔

یہ دستور ہندوستان بھی آیا لیکن ضبط ہوگیا ـــــ اسی دستور میں مولانا نے کمال درجہ حکمتِ عملی اور حزم واحتیاط سے ہندوستان کے تین قدرتی خطوں کی بات کہہ کر علاقائی آزادی لیکن وفاقی حیثیت کا تحفظ کیا۔ (آپ بیتی صـ۱۰۵، ج ۲)

یہ پروگرام یہاں آتے ہی ضبط ہوگیا جس کی ضبطی کی خبر روزنامہ زمیندار ۱۸ مئی ۲۵ء اور سیاست ۱۸ مئی ۲۵ء میں شائع ہوئی (آپ بیتی صـ۱۱۲ ج ۲)

رہ گیا مسئلہ تحریک ریشمی رومال کا تو اس میں مولانا کا جو بنیادی رول ہے اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ انگریز سرکار کا قائم کردہ کمیشن مولانا سے ایسا خوفزدہ تھا کہ اس نے مولانا کو محرک اصلی اور حضرت شیخ الہند کو ان کا مؤید ثابت کیا (جو بہر طور غلط ہے) (ذاتی ڈائری صـ۵۳)

اس تحریک کے ضمن میں تفصیلی حالات انڈیا آفس لائبریری لندن کے ریکارڈ کی بنیاد پر مولانا سید اسعد مدنی نے مرتب کرائے جو پاکستان میں مکتبہ رشیدیہ لاہور اور مکتبہ محمودیہ لاہور کے اشتراک سے شائع ہو چکے ہیں ـــــ مولانا کی ذاتی ڈائری کے صـ۶ پر ترکی وزیر جنگ غالب پاشا کی تحریر کا اقتباس بھی موجود ہے جو حضرت شیخ الہند اور غالب پاشا کے تعلقات کی عکاسی کرتا ہے ۔ اور اس تحریک کے ضمن میں اہم دستاویز ہے ۔

رہ گیا مسئلہ ہندو دوستی کا تو جو حضرات قوم اور ملت کے فرق کو نہیں سمجھتے اور قرآن و سنت نبوی سے بے نیاز ہو کر اپنے ہاتھوں کے تراشے ہوئے صنموں کو پوج رہے ہیں ۔ ان سے ہماری کوئی غرض نہیں رہ گئے انصاف پسند حضرات تو وہ مولانا کی ذاتی ڈائری کا صـ۹۱ اور سرگذشت کابل کا صـ۷۹ دیکھ لیں کہ کس طرح مولانا ہندو کے لتے لیتے ہیں اور اس کے دماغ کی خرابی کا علاج کرتے ہوئے اسے کہتے ہیں کہ اس سرزمین پر جتنا تمہارا حق ہے اس سے زیادہ نہیں تو تمہارے برابر ہمارا حق ضرور ہے ۔ کم کسی شکل نہیں ـــــ رہ گیا پاکستان کا مسئلہ تو ظاہر ہے کہ مولانا اس سے قبل انتقال فرما گئے تھے ۔ اس لئے اس حوالہ سے گفتگو لاحاصل ہے ۔ تاہم میثاق استنبول میں مسلمان کی بالادستی کا واضح تصور موجود ہے جو قابل توجہ ہے ـــــ

اللہ تعالیٰ مولانا مرحوم اور ان کی تفسیر و افکار کے سلسلہ میں کام کرنے والے حضرات سے راضی ہو ۔ آمین

ایں دعا از من و از جملہ جہاں آمین باد !!

قرآن حکیم کی مقدس آیات اور احادیث نبوی آپ کی دینی معلومات میں اضافے اور تبلیغ کے لئے اشاعت کی جاتی ہیں ۔ انکا احترام آپ پر فرض ہے ۔ لہٰذا جن صفحات پر یہ آیات درج ہیں انکو صحیح اسلامی طریقے کیمطابق بیحرمتی سے محفوظ رکھیں ۔

مغربی نظامِ وکالت کی اصلاح

چند اہم تجاویز

مولانا بشیر احمد قاضی محکمہ عدلیہ آزاد کشمیر

کافی دنوں سے وکالت کے پیشہ سے متعلق خبریں اخبارات کی زینت بنی رہی ہیں۔ وکلاء کو یہ خدشہ پیدا ہوا کہ ان کے پیشہ کو ختم کیا جا رہا ہے۔ لاہور کے وکلاء نے اس خدشہ کا اظہار بھی کیا۔ حکومت کی طرف سے ان کو یہ کہا جاتا رہا کہ شبہات غلط ہیں۔ صورتِ حال خواہ کچھ بھی ہو ہمیں یہ دیکھنا چاہیئے کہ وکالت کے پیشہ کی ضرورت کیا ہے؟

نظری حیثیت سے وکیل کا کام یہ ہے کہ وہ عدالت کو قانون سمجھنے اور مقدمہ زیرِ بحث کے حالات پر اسے منطبق کرنے میں مدد دے۔ اصولاً یہ ضرورت اپنی جگہ مسلّم ہے۔ یہ بھی درست ہے کہ ایک مقدمہ میں دو ماہرینِ قانون کی رائیں مختلف ہو سکتی ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ ایک کی رائے میں ایک فریق کا مقدمہ مضبوط ہو تو دوسرے کی رائے میں دوسرے فریق کا اور عدالت کے لیے صحیح نتیجہ پر پہنچنے کے لیے دونوں طرف کے دلائل سے مطلع ہونا یقیناً مفید ہوتا ہے۔

لیکن سوال یہ ہے کہ اس نظریہ کو عملی جامہ پہنانے کی جو صورت پیشۂ وکالت کی شکل میں اختیار کی گئی ہے۔ کیا فی الواقع اس سے یہ دونوں فائدے حاصل ہوتے ہیں؟ ایک وکیل اپنی قانونی مہارت کو لے کر دفتر میں بیٹھ جاتا ہے اور تیار رہتا ہے کہ جس مقدمہ کا جو فریق بھی اس کو بھاری فیس ادا کرنے کے لیے تیار ہو اس کے حق میں وہ قانونی نکات سوچنا شروع کر دے۔ اس کو اس سے کوئی بحث نہیں ہوتی کہ میرا مؤکل حق پر ہے یا باطل پر۔ مجرم ہے یا بے گناہ۔ اپنا حق لینا چاہتا ہے یا دوسرے کا حق مار کھانا چاہتا ہے۔ اس کو اس سے بھی کوئی دلچسپی نہیں ہوتی کہ قانون کا منشاء درحقیقت کیا ہے اور اس کی رو سے اس کے مؤکل کا مقدمہ صحیح ہے یا غلط۔ وہ صرف یہ دیکھتا ہے کہ اس نے مجھے فیس دی ہے اور میرا کام اس کی حمایت کرنا ہے۔ اس لیے وہ مقدمہ کو چھیل بنا کر قانون کے مطابق ڈھالتا ہے۔

کمزور پہلوؤں کو چھپاتا ہے اور موافق پہلوؤں کو ابھارتا ہے۔ گواہوں کے بیانات سے وہ چیزیں چھانٹی کرتا ہے جو اس کے مؤکل کے حق میں ہوں۔ اس طرح وہ اپنی فنی مہارت کی وجہ سے عدالت کو بھی اپنی پسند کی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس کو اس سے کوئی پرواہ نہیں ہوتی کہ حق دار محروم ہو جائے اور محروم شخص حق دار بن جائے۔ اس کے سامنے قانون کے منشاء کی تکمیل کے بجائے اپنے مؤکل کی پسند کو پورا کرنا ہوتا ہے۔ اس کے نزدیک وہی حق پر ہے جو اس کو فیس ادا کر دے۔ اب آپ غور فرمائیں کہ کیا فی الواقع ہمارا دین و مذہب اس کی اجازت دیتا ہے؟ کیا فی الواقع ایسے ماہرین قانون کا مشورہ عدالت کو انصاف کے کام میں کچھ مدد دے سکتا ہے جو علانیہ اس مقصد کے لیے فیس لے بیٹھے ہوں کہ قانون کی تعبیر لازماً اپنے مؤکل کے حق میں کریں گے۔ تعجب کی بات یہ ہے کہ ایک ہی نوعیت کے مقدمہ میں ایک وکیل اپنے مخالف وکیل کے دلائل کی خوب تردید کرتا ہے لیکن اگر اسی نوعیت کے دوسرے مقدمہ میں وہی وکیل مخالف وکیل کی جگہ کھڑا ہو جائے تو وہی دلائل دینے شروع کر دیتا ہے جن کی پہلے مقدمہ میں خود تردید کر چکا ہوتا ہے۔ وہ مسلسل دلائل کے انبار لگائے جاتا ہے خواہ ذاتی رائے اس کے خلاف ہی کیوں نہ ہو۔

اب اگر کہا جائے کہ اسلام اس طرز عمل کی اجازت نہیں دیتا تو اس میں وکلاء کے لیے ناراض ہونے کی کیا بات ہے؟ ایک حدیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ "جو شخص کسی کی ناحق امداد ایک کلمہ سے بھی کرے تو قیامت کے دن اس کی پیشانی پر لکھا ہوگا "آیِسٌ مِنْ رَحْمَةِ اللہ" یعنی یہ شخص اللہ کی رحمت سے مایوس ہونے والا ہے۔"

درحقیقت موجودہ نظام وکالت سرمایہ دارانہ نظام کی پیداوار ہے جس میں اصل مقصد روپیہ جمع کرنا ہوتا ہے۔ قطع نظر اس کے کہ وہ جائز ہے یا ناجائز؟ اس طرح اس نظام وکالت نے ہمارے نظامِ عدل و انصاف کو سخت دھچکا لگایا ہے اور صرف اتنا ہی نہیں کیا ہے کہ ہماری سوسائٹی میں قانون کی پیروی کے بجائے اس کی خلاف ورزی کو وسعت دی اور طاقت بخشی ہو۔ بلکہ اس کا نقصان ہماری پوری اجتماعی زندگی میں پھیل گیا ہے اور ہماری سیاست بھی اس کی وجہ سے گندی ہو کر رہ گئی ہے پچھلی دس بارہ صدیوں میں آدھی سے زیادہ دنیا پر مسلمانوں نے حکومت کی ہے اور کہیں ان کے نظامِ عدالت میں اس طرح کے قانونی پیشے کا ہمیں نشان نہیں ملتا۔ البتہ شورائیت کا قانون رائج تھا۔ اگر عدالت کو کسی مسئلہ میں تعاون کی ضرورت پڑتی تو ماہرین قانون سے مشورہ کر سکتی تھی۔ وہ ماہرینِ قانون

چونکہ کسی فریق مقدمہ کے وکیل نہیں ہوتے تھے اس لیے ان کا مشورہ صحیح انصاف تک پہنچنے میں مددگار ثابت ہوتا تھا۔ مگر اس وقت ہمارے ملک میں وکالت کا پیشہ جو رُخ اختیار کر گیا ہے اس سے جلد اور سستا انصاف مہیا ہونا انتہائی مشکل ہے۔ اس وقت صورت حال یہ ہے کہ انصاف لینے کے لیے عمر نوحؑ اور خزانۂ قارون چاہیئے۔ وکیل جب جرح کرنے کے لیے کھڑا ہوتا ہے تو قانونی نکات کی وضاحت پر کم توجہ ہوتی ہے۔ زیادہ تر توجہ اس بات پر ہوتی ہے کہ وہ طویل ترین جرح کر کے اپنے مؤکل کو خوش کر لے اور اپنے آپ کو عوام کی نگاہ میں ایک قابل ترین وکیل ظاہر کر کے ان کی توجہات کا محور بن جائے۔ اس وقت اس کو اس بات کی پرواہ نہیں ہوتی کہ اس کی طویل جرح سے دوسرے لوگ جو باہر اپنی باری کا انتظار کر رہے ہوتے ہیں ان کی انتظار کی گھڑیاں لمبی ہو رہی ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے صبح سے شام تک دوسرے مقدمہ کا گواہ مایوس ہو کر واپس چلا جاتا ہے اور آئندہ عدالت کی طرف رُخ کرنے سے گریز کرتا ہے پھر ممکن ہے کہ وہ چھ ماہ تک بھی دوبارہ عدالت کو دستیاب نہ ہو۔ اس طرح مقدمہ زیر سماعت کی عمر اور لمبی ہو جاتی ہے۔ اگر وہی گواہ کہیں بیرونِ ملک چلا گیا یا مر گیا تو مقدمہ کا حشر جو ہوگا وہ ظاہر ہے۔ اس مصروف ترین زندگی میں اتنا وقت کسی کے پاس نہیں ہوتا کہ وہ بار بار عدالتوں کا چکر کاٹتا پھرے اور صبح سے لے کر شام تک احاطۂ عدالت میں کھڑے اپنی باری کے انتظار میں خون خشک کرتا رہے۔ اس میں شک نہیں کہ عدالت کو یہ اختیار ہوتا ہے کہ وہ نامعقول جرح سے وکیل کو روک دے مگر عملاً ہوتا یہ ہے کہ جب عدالت اس طرح کسی وکیل کو روکے تو آگے وہ اپنی بات کو معقول ظاہر کرنے کے لیے دلائل شروع کر دیتا ہے۔ اس طرح سے بھی وقت خرچ ہو جاتا ہے اور پرنالہ اپنی جگہ پر ہی ہوتا ہے بلکہ ایسی صورت میں اگر عدالت کے احترام میں اس وقت خاموش بھی ہو جائے تو اس کے پاس مقدمہ کی تاخیر کے جو دوسرے دروازے ہوتے ہیں ان سے کام لے لیتا ہے۔

مثلاً یہ کہ وہ عدالت کے رویے کو جانب داری پر محمول کر کے مقدمہ کو منتقل کرانے کی کوشش میں لگ جاتا ہے۔ پھر مقدمہ کے انتقال میں ایک مخصوص طریقہ کار ہے جس کو پورا کرنے میں ممکن ہے دو ماہ کا مزید وقت لگ جائے۔ مزید برآں یہ کہ ایک وکیل کو ابتدائی درجہ کی عدالت سے لے کر ملک کی سب سے آخری عدالت تک مقدمات میں پیش ہونے کی اجازت ہوتی ہے۔ اس لیے وکیل اس قانون سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ہر عدالت کے مقدمات کو لے لیتا ہے اس سے گو اس کو کافی

فائدہ پہنچ جاتا ہے مگر اس کا اثر یہ ہوتا ہے کہ جب وہ کسی ایک عدالت میں پیش ہوتا ہے تو اس کے مقدمات جو دوسری عدالتوں میں ہوتے ہیں ان میں اس کی عدم حاضری کی وجہ سے ایک طرف عدالت کو انتظار کرنا پڑتا ہے اور دوسری طرف مقدمہ کے فریقین اور گواہان کو انتظار رہتا ہے۔ بعض اوقات اس کی اس روش کی وجہ سے آگے تاریخ بغیر اس دن کی مطلوبہ کارروائی کے، پڑ جاتی ہے اور مقدمہ اور لمبا ہو جاتا ہے۔ اس طرزِ عمل سے واضح ہے کہ جلد انصاف ملنے کا خواب کیسے شرمندۂ تعبیر ہو سکتا ہے۔

اسی صورتِ حال کے پیشِ نظر بعض لوگوں کا یہ خیال ہے کہ وکیل کو سیاست میں حصہ نہیں لینا چاہیئے اس لیے کہ وہ کبھی کسی جلسہ میں ہوتا ہے اور کبھی کسی میں۔ اس کو قید و بند کی صعوبتوں سے بھی گذرنا پڑتا ہے اس طرح سے اس کے متعلقہ مقدمات پر بہت بُرا اثر پڑتا ہے۔ فریقین جو اس کو فیس ادا کر چکے ہوتے ہیں وہ اتنی سکت نہیں رکھتے کہ اب وہ نئے وکیل کو فیس ادا کر کے مقدمہ کی پیروی کے لیے کھڑا کریں۔ انجام کار فیس ادا کرنے والا فریق وکیل کے رحم و کرم پر ہی ہو جاتا ہے۔ ان حضرات کی یہ دلیل واقعی معقول اور قابلِ توجہ ہے اگر کسی وکیل کو سیاست کا شوق ہو تو اس کو حق ہے کہ یہ شوق پورا کرے مگر اس میں اس کو یہ خیال رکھنا چاہیئے کہ اس شوق کی تکمیل میں بندوں کے حقوق جو اُس نے اپنے ذمے لے لیے ہیں وہ اس شوق کی نظر نہ ہو جائیں۔ فیس لینے کے بعد اس کا اپنے مؤکل کے ساتھ مقدمہ کی پیروی کرنے کا ایک عہد معاہدہ ہو جاتا ہے۔ اگر وہ دوسری مصروفیات میں رہے تو ظاہر ہے کہ وہ اس عہد کے ایفاء میں ناکام رہتا ہے اور ایسا تو کبھی سننے میں نہیں آیا کہ دیگر مصروفیات کی وجہ سے اگر وہ مقدمہ کی پیروی نہ کر سکا ہو تو اس نے مؤکل کو فیس واپس کر دی ہو۔ خصوصاً فوجداری مقدمات میں جو لوگ وکیل کے ذریعہ ہر تاریخ پر اصالتہً حاضری سے مستثنیٰ نہ ہوتے ہیں ان کی جگہ وکیل کی حاضری ہر تاریخ پر لازمی ہوتی ہے ورنہ ان کی مستثنائی منسوخ کی جا کر ان کی طلبی ضروری ہو جاتی ہے اور ان کے ضمانان کی ضمانت بھی ضبط کی جاتی ہے مگر ایسی صورت میں مستثنیٰ شدہ افراد کو یہ علم نہیں ہوتا کہ ان کا وکیل حاضر نہیں ہوتا۔ وہ اپنے کار روزگار میں اندرون ملک یا بیرون ملک جا چکے ہوتے ہیں۔ پھر ان کے خلاف عدالت ۵۱۲ ض ف کی کارروائی عمل میں لاتی ہے۔ اس سے مقدمہ طویل سے طویل ترین بن جاتا ہے۔ اگر وکلاء اپنے ہم پیشہ عظیم سیاست دانوں یعنی قائدِ اعظم، لیاقت علی خان، اور شاعرِ مشرق علامہ اقبال کے نقشِ قدم پر چلیں تو اس طرح کی خامیوں کا ازالہ ہو سکتا ہے۔ انہوں نے جب سیاست میں حصہ لینا شروع کیا

تو پہلے انہوں نے مقدمات کی پیروی کرنی ترک کر دی تھی۔ درحقیقت دونوں کام سرانجام دینے بیک وقت عملاً ممکن بھی نہیں۔

ہمارے اس تجزیے سے آپ کو معلوم ہو گیا ہو گا کہ وکالت کے موجودہ نظام کو جوں کا توں اگر باقی رکھا جائے تو جلد انصاف کا خواب کبھی بھی پورا نہ ہو گا۔ اسی طرح اس نظام کے تحت انصاف سستا بھی ممکن نہیں۔ اس لیے کہ آٹے دال اور چینی وغیرہ اشیاء کی طرح وکیل کی فیس کسی پرائس کنٹرول کے تحت نہیں ہوتی۔ ہر وکیل کی فیس کا بھاؤ اپنا ہوتا ہے۔ جو وکیل زیادہ ذہین اور محنتی ہو گا وہ بجائے اس کے کہ اپنی اس خداداد صلاحیت کو صحیح انصاف کے احیاء پر مرکوز رکھے اور اس قابلیت کا شکر ادا کرے وہ اپنی فیس کو بہت بھاری رکھتا ہے جس کا اثر یہ ہوتا ہے کہ اس کی صلاحیت کا فائدہ سرمایہ دار کو تو پہنچ سکتا ہے لیکن غریب مظلوم اپنی غربت کی سزا کاٹتے ہوئے ظالم سرمایہ دار کے بھینٹ چڑھ جاتا ہے۔ جرائم پیشہ اور تخریب کار لوگوں کے پاس سرمایہ کی کوئی کمی نہیں ہوتی وہ جرم کے ارتکاب سے قبل ہی اس کا بندوبست کر لیتے ہیں بلکہ اپنے ذہن میں وکیل کے بارے میں بھی سوچ لیتے ہیں۔ چنانچہ وہ اپنا کام مکمل کرنے کے بعد فوراً نذرانہ لے کر اس کے دفتر میں پہنچ جاتے ہیں اور آگے اس کا ذہن و دماغ ان کو بے گناہ ثابت کرنے کے طریقے تلاش کرنا شروع کر دیتا ہے۔ اس میں اس امکان کو بھی رد نہیں کیا جا سکتا کہ جو فیس اس کو ادا کی گئی ہو وہ درحقیقت مقتول کی جیب سے ہی قاتل نے لائی ہو۔ مقتول کے ورثاء کو مالی اعتبار سے اوّل تو پولیس ہی نیم جان کر دیتی ہے اور رہی سہی کسر وکیل نکال لیتا ہے۔ اس صورتِ حال کے پیشِ نظر غریب اور بے کس لوگ ظلم پر صبر کر لیتے ہیں لیکن مقدمہ دائر کرنے سے گریز کر جاتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ اس نظام کے تحت سستے اور جلد انصاف کی توقع رکھنا سہ

ایں خیال است و محال است و جنوں

آج ہماری عدالتیں مقدمات سے بوجھل ہو چکی ہیں۔ عدالتوں کی الماریوں میں مسلوں کی تعداد اتنی زیادہ ہے کہ جگہ ہی نہیں۔ ہر سال الماریوں میں اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ ——— اس میں شک نہیں۔ کہ مقدمات کی تاخیر میں دیگر عوامل بھی ممکن ہیں مگر اس میں مرکزی کردار ہمارے موجودہ مغربی نظام وکالت کا ہے۔ جب یہ نظام نہیں تھا تو مقدمہ بازی بھی ناپید تھی۔ یہاں یہ ذکر بے محل نہ ہو گا کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے

زمانے میں ایک مرتبہ کوفہ کے چیف جج حضرت سلمانؓ بن ربیعہ باہلی اپنی عدالت میں مسلسل چالیس دن ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہے، صرف اس لیے کہ ان کے پاس سرے سے کوئی مقدمہ آیا ہی نہیں (الاستیعاب)۔

اس سے بھی زیادہ عجیب واقعہ یہ ہے کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ کے زمانے میں جبکہ حضرت عمر رضی اللہ تعالےٰ عنہ مدینہ کے قاضی تھے، پورا ایک سال گذر گیا کہ ایک مقدمہ بھی ان کے سامنے پیش نہ ہوا، اس وقت اگر مقدمہ بازی سکھانے والا کوئی ہوتا تو ان کو بھی یہی مشکل پیش آسکتی تھی۔

ہمارے مغربی نظام وکالت نے سرمایہ دار طبقہ کی حوصلہ افزائی کی ہے اور جرائم کو ختم کرنے کے بجائے ان کی آبیاری کی ہے، تاخیری حربوں کے بے شمار طریقے اختراع کرکے مقدمات کا ڈھیر لگانے میں مدد دی ہے۔ اگر اس نظام کی اصلاح نہ کی گئی تو مظلوم اس نظام کی بھٹی میں مزید ظلم کا شکار ہوگا اور ظالم اپنے جور و استبداد کے پنجے اور مضبوط کرے گا۔ اس مرحلہ پر اس نظام کی اصلاح کی مندرجہ ذیل تجویز پیش کی جاتی ہے۔

یعنی یہ کہ نظام وکالت کو نظام شورائیت سے تبدیل کیا جائے جس کا مطلب یہ ہے کہ عدالت کو انصاف تک پہنچنے کے لیے ماہرین قانون کی امداد کی ضرورت ہوتی ہے لہٰذا ہر عدالت کے ساتھ ایسے افراد کو بطور مشیر مقرر کیا جائے۔ اس سے نظام وکالت کے قیام کا جو مقصد تھا بطریق احسن پورا ہو جاتا ہے۔ عہد رسالتؐ عہد صحابہؓ اور اس کے بعد کئی صدیوں تک شورائیت کا نظام دیگر شعبوں کی طرح خود عدالت کے معمول میں بھی رہا ہے۔ ایک دو مثالیں اس وقت بھی پیش کی جاتی ہیں۔ حضرت ابوموسیٰ رضی اللہ تعالےٰ عنہ حضرت عثمان رضی اللہ تعالےٰ عنہ کے زمانے میں کوفہ کے حاکم اعلےٰ تھے اور سلمان بن ربیعہ قاضی تھے۔ ایک شخص نے ان دونوں کے پاس اپنا مقدمہ پیش کیا کہ ایک شخص کا انتقال ہوگیا ہے اس نے ایک بیٹی، ایک پوتی اور ایک بہن چھوڑی ہے اس کا ترکہ کس طرح تقسیم کیا جائے۔ ان کی اپنی رائے یہ تھی کہ نصف ترکہ بیٹی کا حق ہے، اور نصف پوتی کا اور ہمشیرہ محروم ہے۔ مگر انہوں نے اس مسئلہ میں حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے بھی مشورہ کیا تو انہوں نے حدیث پیش کرتے ہوئے ان کی رائے کے خلاف فتویٰ دیا۔ انہوں نے کہا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کی رو سے نصف بیٹی کو، چھٹا حصہ پوتی کو اور ہمشیرہ کو باقیماندہ دیا جائے۔ چنانچہ اس فتویٰ کے بعد انہوں نے اپنی رائے اسی کے مطابق تبدیل کر دی حضرت

عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ایک مرتبہ ایک عورت پر حد کی سزا عائد کی۔ جب حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے اس بارے میں دریافت کیا گیا تو آپؓ نے فرمایا یہ حاملہ ہے۔ یہ سنتے ہی حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ چونک اُٹھے اور حکم کو وضع حمل تک ملتوی کر دیا اور حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے فرمایا" لولا علیؓ لھلک عمر" یعنی اگر علی نہ ہو ہوتے تو عمر ہلاک ہو جاتا۔ حضرت امام ابوحنیفہؒ کے زمانے میں چیف جسٹس" ابن ابی لیلیٰ" تھے۔ ایک مرتبہ انہوں نے ایک عورت پر حد کی سزا عائد کی تو امام ابوحنیفہؒ سے جب دریافت کیا گیا تو آپ نے اس فیصلہ میں چھ غلطیاں نکالیں۔ ان مثالوں سے یہ بات واضح ہے کہ" قضاۃ" اپنے فیصلوں کے بارے میں مشورہ بھی کرتے رہے ہیں، البتہ وہ دور چونکہ خیر و صلاح کا دور تھا۔ حکومت کو باضابطہ طور پر مشیر مقرر کرنے کی ضرورت نہ تھی اس لیے کوئی باضابطہ ادارہ وجود میں نہ آیا تھا۔ مگر اب رفتار زمانہ کی وجہ سے انتظامی ضرورت اس بات کا تقاضا کر رہی ہے کہ ہر عدالت کے ساتھ قانون کے ماہرین کی تقرری بطور مشیر قانون عمل میں لائی جائے اور عدالت گواہان پر خود جرح بھی کرے۔ اگر کوئی ضروری بات عدالت کے پوچھنے سے چوک جائے تو مشیروں کو بھی توجہ دینے کا حق ہونا چاہیئے۔ اس طرز عمل کا ایک طرف وکلاء کے چنگل سے گواہان اور فریقین کو آزادی مل جائے گی۔ دوسری طرف یہ بھی فائدہ ہوگا کہ گواہ خوشی سے عدالت میں آنے کی کوشش کرے گا۔ اس وقت تو صورت حال کچھ اس طرح ہے کہ سچا گواہ عدالت سے گریز کرتا ہے۔ وکلاء کی تیز و تند جرح سے اس کے اوسان اپنی جگہ پر قائم رہنے مشکل ہو جاتے ہیں۔ اگر کوئی واقعہ رونما ہو جائے لوگ وہاں سے بھاگنے لگ جاتے ہیں اس ڈر سے کہ کل کون وکلاء کا تختۂ مشق بنا رہے گا۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس طرز عمل سے جھوٹے اور پیشہ ور گواہان کو فروغ حاصل ہوتا ہے۔ اسلام نے ایک طرف اگر گواہ کو یہ حکم دیا ہے کہ وہ سچی گواہی کو چھپائے نہیں اور عدالت کی طلبی پر حاضر ہو جائے تو دوسری طرف زبانِ رسالت سے یہ بھی اعلان کیا گیا کہ" اکرموا الشھود" یعنی گواہان کے ساتھ عزت و احترام کا معاملہ کیا جائے لیکن جب موجودہ نظام کے تحت گواہ عدالت میں آتا ہے تو وکیل کو یہ توقع ہوتی ہے کہ اگر وہ زبان کھولے تو اس کے مطلب کے لیے کھولے۔ اگر اس کے مطلب کے مطابق جواب نہ آئے تو وہ جھنجھلا کر اس کو درغلیدہ قرار دینے کی درخواست کرتا ہے یا ہیر پھیر کر کے مشکل سوالات میں گواہ کو پھنسا دیتا ہے۔ ایک دیہاتی گواہ وکیل کی مہارت کے سامنے بے بس ہو کر رہ جاتا ہے۔ ان حالات میں اگر عدالت خود جرح کرے تو نہ صرف سچے گواہوں کی حوصلہ افزائی

ہو گی بلکہ اس سے ایک فائدہ یہ بھی ہو گا کہ عدالت کی جرح چونکہ غیر جانب دار ہو گی۔ اس لیے عدالت کی جرح سے مقدمہ کے بہت سے خفیہ پہلو سامنے آجائیں گے جو وکلاء کی جرح سے ممکن ہے ابھی تک پردہ اخفاء میں ہی رہیں اس لیے کہ ہر وکیل اپنے مطلب کی جرح کرے گا اس سے ممکن ہے ایسے پہلو رہ جائیں جن کا تعلق نفسِ واقعہ کی وضاحت سے ہو۔

ہماری اس تجویز سے موجودہ نظام وکالت سے جو مقصد تھا وہ اس تجویز سے انتہائی بہتر انداز سے پورا ہو جاتا ہے اور اس نظام کی خرابیوں سے بھی نجات مل جاتی ہے۔ اس کے بعد پھر سوال پیدا ہوتا ہے کہ نظام شورائیت کے قیام کے بعد کیا اس مغربی نظام وکالت کی ضرورت باقی رہتی ہے؟ اس کا جواب بالکل واضح ہے کہ انصاف کے حصول کے لیے اس نظام کی ضرورت بالکل نہیں رہتی۔ البتہ ایک دوسری دلیل اس نظام کے باقی رکھنے کے سلسلہ میں دی جا سکتی ہے۔ وہ یہ کہ جو لوگ متاثر ہوں گے ان کی روٹی کا مسئلہ کس طرح حل ہو گا؟ یہ سوال واقعی خاصا پریشان کن ہے مگر اس کا کچھ حل تو اس طرح نکل آتا ہے کہ بعض وکلاء کو عدالت کا مشیر مقرر کیا جائے اور ان کو باقاعدہ تنخواہ دی جائے دیگر حضرات کو حکومت دوسرے شعبوں میں ملازمت کے مواقع مہیا کرے۔ ایک دوسری دلیل اس نظام کو باقی رکھنے کے لیے یہ بھی دی جا سکتی ہے کہ عوام کے لیے مقدمہ کو قابل رفتار بنانے کے لیے رہنمائی کی ضرورت ہوتی ہے۔ لہٰذا اس نظام وکالت کو ان کی رہنمائی کے لیے باقی رکھنا ضروری ہے۔

بلاشبہ ان کی رہنمائی کا اصول بھی مسلّم ہے۔ مگر ان کے مقدمات کو آج کل بھی عدالتوں کے ساتھ جو اپیل نویس حضرات ہوتے ہیں وہ ان کے مقدمات کو قانونی صورت میں تحریر کر دیتے ہیں، یہ ضرورت تو ان سے بھی پوری ہو سکتی ہے۔ اگر کوئی کمی محسوس ہو تو اپیل نویسی شعبہ کو ہی زیادہ مؤثر بنایا جا سکتا ہے۔ البتہ ان کو عدالت کے اندر مقدمہ کی پیروی کی اجازت نہ دی جائے۔

اگر حکومت ہماری اس تجویز کو تسلیم کر لے تو انصاف جلد اور سستا مہیا ہو گا۔ اس کے باوجود اگر کوئی خامی رہے تو اس کی اصلاح بھی کی جا سکتی ہے لیکن اگر حکومت انصاف کے راستہ میں اس سنگ گراں کو ہٹانے کے حق میں نہ ہو تو پھر کم از کم ہماری متبادل مندرجہ ذیل تجاویز کو عملی شکل دے۔

۱۔ مقدمات کی درجہ بندی کی جائے اور ہر مقدمہ کی فیس کا تعین کیا جائے قتل جیسے سنگین مقدمہ کی فیس ایک ہزار روپیہ سے زائد نہ ہو۔ یہی صورت دیگر سنگین نوعیت کے مقدمات میں بھی ملحوظ رکھی جائے۔

۲۔ وکلاء کی درجہ بندی کی جائے جو وکلاء اعلیٰ عدالتوں میں پیش ہوں ان کو ماتحت عدالتوں کے مقدمات میں پیش ہونے کی اجازت نہ دی جائے تاکہ فریقین اور ماتحت عدالتوں کو انتظار نہ کرنا پڑے۔ البتہ اگر کوئی خاص مجبوری ہو تو اسی کی حد تک الگ سے عارضی اجازت لے کر پیش ہوں۔

۳۔ جو وکلاء سیاست میں حصہ لینا چاہیں اس کی ان کو اجازت حاصل ہو مگر اس کے بعد ان کو وکالت کا کاروبار کرنے سے روک دیا جائے۔

۴۔ وکلاء کو دفاتر حکومت مہیا کرے اور ان سے معمولی کرایہ وصول کرے۔

۵۔ وکیل کی ماہانہ آمدن کا اندازہ اسی قدر ملحوظ رکھا جائے جتنی اس جج کی تنخواہ ہو جس کے سامنے وکیل پیش ہوتا ہو۔ البتہ اگر جج کو تنخواہ کے علاوہ دیگر مراعات حاصل ہوں تو اسی قدر اس کو زائد فیس کی اجازت ہو۔ وکیل کے کوائف کو جج کے ساتھ ہم آہنگ کرنے اس لیے بھی ضروری ہیں کہ موجودہ مغربی نظام وکالت میں بھی وکیل کی حیثیت کا تعین "پارٹ آف دی کورٹ" (Part of the court) کے الفاظ سے کیا گیا ہے یعنی "وکیل عدالت کا بازو ہوتا ہے" اور ظاہر ہے کہ بازو کا ایک جیسا موٹا ہونا ہی بدن کی صحت کا باعث ہوتا ہے۔

۶۔ ضمانتوں کے سلسلہ میں وکیل کو پیش ہونے کی اجازت نہ دی جائے۔ اس لیے کہ ان میں کوئی پیچیدہ بات نہیں ہوتی کہ فریقین کو کوئی پریشانی ہو۔ اس لیے فریقین از خود پیش ہوں۔

۷۔ وکیل جس مقدمہ میں ایک دفعہ فیس وصول کرلے اس مقدمہ میں اگر اس کو اپیل کورٹ میں پیش ہونے کا حق ہو تو قانوناً اس کو دوبارہ فیس لینے کا حق حاصل نہ ہو بلکہ پہلی فیس پر ہی مقدمہ کی پیروی کرے۔ البتہ اگر اس کا مؤکل دوسرا وکیل مقرر کرنا چاہے تو یہ اور بات ہے۔

درحقیقت وکالت کا پیشہ کوئی تجارت کی منڈی نہیں ہے جہاں انصاف بکتا ہو بلکہ یہ پیشہ ٹوٹے ہوئے دلوں کا سہارا ہے۔ اس پیشے کو اختیار کرنے والا اس عزم کے ساتھ آئے کہ وہ زخمی دلوں پر نمک نہیں چھڑکے گا بلکہ ان کی مرہم پٹی کی خدمت کو اپنے لیے متاع حیات بنائے گا۔

ایک مجاہد عالم اور درویش

علّامہ سیّد سُلیمان ندوی رح

۱۰ محرم الحرام ۱۳۵۹ھ عین عشورہ کے دن علم و عمل فضل و کمال مجاہدہ و استقامت اور تقویٰ و طہارت کی ایک ایسی مسند خالی ہوئی جو غالباً عرصۂ دراز تک خالی رہے گی "انا للہ وانا الیہ راجعون"

اس سے ہماری مراد حضرت مولانا معین الدین اجمیری رحمۃ اللہ علیہ کا سانحہ ارتحال ہے! یہ حادثہ محض مولانا کے اہلِ خاندان یا مسلمانانِ اجمیر ہی کے لئے نہیں ہے۔ بلکہ سارا اسلامی ہند اس سے متاثر اور اپنی کم نصیبی پر نوحہ کناں ہے!

وماکان قیس ملکہ ھلک واحدا

ولکنہ بنیان قوم تھدّما

مولانا ایک نومسلم گھرانے میں پیدا ہوئے تھے والد ماجد مولانا عبدالرحمٰن صاحب مرحوم بلیا کے رہنے والے نومسلم راجپوت تھے اور والدہ بھی داخل اسلام ہوئی تھیں اور دانا پور (بہار) ان کا گھر تھا! تعلق راج پوتانہ سے اس طرح پیدا ہوا کہ مولانا عبدالرحمٰن صاحب ریاست ٹونک میں سکریٹری کونسل تھے چار پانچسو روپیہ تنخواہ ملتی۔ اسی علاقہ میں دیولی (راجپوتانہ) میں ۲۵۔ صفر ۱۲۹۱ھ کو پیدا ہوئے۔ اور باپ کے زیرِ سایہ زندگی کی ابتدائی منزلیں طے ہوئیں بچپن ہی سے سعادت و فیروز مندی کے آثار نمایاں تھے چنانچہ دولت و ثروت کی گود میں پلنے والے اس نوجوان نے ہمیشہ طالب علموں میں مساوات ہی کی زندگی بسر کی۔ امیرانہ ٹھاٹھ اور رئیسانہ شان کا کبھی مظاہرہ نہ کیا!

معقول و منقول کی تکمیل مولانا برکات احمد صاحب سے ہوئی علم ریاضی مولانا حضرت لطف اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے حاصل فرمایا۔ بائیس سال کی عمر میں ایسا رسوخ ہوگیا۔ کہ جس کی نظیر کم دیکھی گئی ہے اسی وقت سے درس و تدریس کا سلسلہ جاری ہوگیا۔ ہندوستان، اور ہندوستان سے باہر، بلخ، بخارا، چین، افغانستان اور دوسرے ممالک سے طلبہ جوق در

جوق آنا شروع ہو گئے۔ اسی زمانہ میں ایک خاص واقعہ نے آپ کی شہرت کو چار چاند لگا دیئے۔ واقعہ یہ ہے کہ مولانا عبدالحق صاحب تفسیر حقانی کے زیر اہتمام آریوں سے ایک مناظرہ ترتیب پایا تھا۔ آریوں کی طرف سے پنڈت واشنانند جی بحث کر رہے تھے، مسلمانوں کی طرف سے بھی بڑے بڑے مناظر گفتگو کر رہے تھے، تین دن سے سلسلہ جاری تھا جب مولانا کی باری آئی تو آپ نے رُوح، مادہ، پرمیشور کی قدامت کے سلسلے میں حدوث و قدم کی طویل بحث کو اس خوبی سے بیان فرمایا کہ صرف ۷ منٹ میں پنڈت جی لاجواب ہو گئے اور موافق و مخالف آپ کے تبحر علمی کے قائل ہو گئے۔!

ڈھائی سال مدرسہ نعمانیہ میں صدر مدرس رہنے کے بعد ۱۳۲۶ھ میں اجمیر کو شرف سکونت بخشا اور ۱۳۲۶ھ میں مدرسہ معین الدین قائم کیا۔ سرکار نظام جب اجمیر تشریف لائے اور حضرت مولانا کے درس میں مسلسل چھ وقت شریک ہوئے تو اس قدر متاثر ہوئے کہ خلعت شاہانہ سے سرفراز فرمایا اور مولانا انوار اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی تحریک پر مدرسہ معین الحق کو معینیہ عثمانیہ قرار دے کر ساڑھے بارہ سو روپیہ ماہانہ اس کے لئے جاری فرما دیا۔ مولانا اس مدرسہ کے صدر مدرس ہوئے اور پندرہ سال تک یہاں درس دیا ۱۳۳۶ھ کارپردازان مدرسہ اور مولانا میں اختلاف ہوا۔ چنانچہ انہوں نے استعفاء دیکر محرم ۱۳۳۷ھ میں دارالعلوم حنفیہ صوفیہ کے نام سے ایک دوسرا مدرسہ قائم فرمایا! اور ۱۲ سال تک اس مدرسہ کے طلباء کو اپنے فیوض علمی و عملی سے سرفراز فرمایا ۱۳۵۱ھ میں مدرسہ کے اراکین حضرت مولانا کو پھر اپنے یہاں واپس لائے۔ لیکن سیاسی اختلافات کے نتیجہ کے طور پر ۱۲ مارچ ۱۹۳۹ء کو بحکم سرکار نظام دارالعلوم معینیہ عثمانیہ سے آپ الگ ہو گئے۔ لیکن اس علیحدگی کے بعد بھی حلقۂ درس پوری آب و تاب کے ساتھ قائم رہا۔ اس زمانہ میں درس و تدریس میں دوسرے علمی مشاغل بھی شامل رہے چنانچہ مولانا نے تصانیف کا ایک معتدبہ ذخیرہ چھوڑا ہے، جس کا اکثر حصہ ابھی طبع نہیں ہو سکا ہے، مثلاً ترمذی شریف کا ایک ناتمام حاشیہ وجود علم و معلوم، کلی طبعی، اور مسئلہ دہر پر مکمل اور جامع تقریریں، حضرت خواجہ غریب نواز کی محققانہ سوانح عمری وغیرہ! یہ چیزیں انشاء اللہ جب اہل علم کے سامنے آئیں گی، اس وقت ان کو معلوم ہوگا کہ اجمیر کے اس بوریا نشین کی نگاہ تحقیق کتنی بلند تھی۔

آخری زمانہ میں درگاہ بل کی اصلاح کے متعلق جو فتوے مولانا نے مرتب فرمایا تھا۔ وہ اس قدر جامع اور مؤثر تھا کہ ایک طرف تو ہندوستان اور حرمین کے علماء نے اس کی تائید کی اور دوسری طرف ممبران اسمبلی نے اس بل کے ان تمام نقائص کو دور کیا جن کا شریعت اسلام سے تصادم ہوتا تھا!

یہ تھی مولانا کی علمی زندگی، عملی زندگی کا یہ حال تھا کہ اجمیر میں صدر بدعات کا خاتمہ کیا، اسلامی نقطۂ نظر سے ملک کی صحیح رہنمائی میں باوجود چند اور چند مشکلات کے کبھی مطلق کمی نہیں فرمائی۔

تحریک خلافت میں مذہبی فتویٰ کے جرم میں دو سال کی قید و بند کو اس پامردی اور عالی ہمتی سے برداشت کیا کہ علی برادران نے قدم چوم لیا جس زمانہ ابتلا میں مولانا کفایت اللہ صاحب صدر جمعیۃ العلماء اور مولانا احمد سعید صاحب ناظم جمعیۃ العلماء قید و نظر بندی کی تکلیفیں اُٹھا رہے تھے۔ اس وقت تحریک کی رہنمائی کیلئے آپ ہر ہفتہ دہلی تشریف لے جاتے اور جامع مسجد میں نماز جمعہ کے بعد مسائل حاضرہ پر تقریر فرماتے جمعیۃ العلماء کے اجلاس امروہہ کی صدارت فرمائی اور مستقل نائب صدر رہے صوبہ راجپوتانہ کی مجلس خلافت کو آپ کی صدارت کا ہمیشہ فخر حاصل رہا، تحریک کشمیر کے زمانہ میں مجلس احرار اسلام کے ڈکٹیٹر رہے، مسلمانوں کے سوا برادران وطن بھی آپ کی سیاسی بصیرت کے معترف اور اس سے متاثر تھے۔

ان علمی اور سیاسی مشاغل کے ساتھ ساتھ سلوک اور تزکیہ باطن کی طرف بھی پوری توجہ تھی، مولانا کے والد حضرت شاہ عبدالرزاق صاحب فرنگی محلی سے بیعت تھے، اور خود مولانا شاہ صاحب کے صاحبزادہ حضرت مولانا شاہ عبدالوہاب (والد حضرت مولانا عبدالباری صاحب فرنگی محلی مرحوم) سے بیعت تھے!

استغناء، رجوع الی اللہ، توکل وغیرہ آپ کی طبیعت ثانیہ بن چکے تھے آخری سال تو بڑے ہی صبر و استقامت اور متوکلانہ زندگی کے تھے، فرائض تعلیم و افتاء اور رشد و ہدایات کی ادائیگی کے بعد کبھی لوگوں میں بلا ضرورت نہ ٹھیرتے، ارباب وطن اہل دنیا خصوصاً امراء و حکام سے ہمیشہ بے تعلق رہے۔ لیکن جب کوئی خدمت والا میں حاضر ہوتا تو اپنے قلب میں مولانا کے اخلاق فاضلہ کا خاص اثر لے کر واپس جاتا!

عبادت کا یہ حال تھا کہ فرائض کے سوا نوافل و مستحبات کے بھی ہمیشہ پابند رہے تادم واپسیں اپنے اوراد و وظائف میں فرق نہ آنے دیا۔ حق گوئی میں کسی بڑی سے بڑی طاقت سے بھی نہیں ڈرے، اسلاف کی سنت کے مطابق قید و بند کی مصیبت سے بھی دوچار ہوئے لیکن اس کو بھی ہنسی خوشی برداشت کیا، اور ہمیشہ وہی کیا جو ایک مجاہد اور ربانی عالم کو کرنا چاہیئے۔

ذات نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ محبت و شیفتگی کا یہ عالم تھا کہ بخاری وغیرہ میں جب یہ حدیث آئی کہ حضور کے مرض وفات کی تکلیف دیکھ کر حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا بے اختیار پکار اٹھیں "یا ابتاہ" (اے میرے باپ، سرکار دو عالمؐ نے فرمایا "لا کرب علی ابیک بعد الیوم" (آج کے دن کے بعد تمہارے باپ پر مصیبت نہیں ہے، تو اس جملہ پر حضرت مولانا بیتاب ہو جاتے، آنسو نکل آتے، چیخ نکل آتی بسا اوقات غشی طاری ہو جاتی مدرسہ میں درس دیتے وقت ہر مرتبہ یہ واقعہ پیش آیا ہے۔!

طلبہ اور علماء سے بہت محبت فرماتے تھے ہونہار طالب علم مولینا کا مرکز توجہ بن جاتا تھا، ہر سال موسم بہار میں طلبہ کا ایک تفریحی جلسہ جس کو اجمیر کی اصطلاح میں "گوٹ" کہتے ہیں، منعقد ہوتا، اس جلسہ میں ہر ملک کے طلبہ کے مروجہ کھیلوں کا مظاہرہ ہوتا تھا۔ مولینا طلبہ کی خاطر اس تفریحی اجتماع میں بھی شرکت فرماتے بیت بازی ہوتی، اس میں ایک فریق کی طرف مولانا بھی ہوتے آپ ہی کا فریق اکثر غالب رہتا، اسلئے کہ مولانا کو اردو فارسی کے ہزارہا اشعار یاد تھے۔

یہ واقعہ حیرت کے ساتھ سنا جاتا ہے کہ ڈیڑھ سو روپیہ مشاہرہ پاتے تھے۔ لیکن تیس روپیہ ماہوار کے سوا باقی رقم طلبہ، سامان تعلیم اور نادر کتب کی فراہمی پر صرف کر دیتے تھے، کتاب کتنی ہی قیمتی ہو لیکن امکان بھر اسی کو ضرور خریدتے اور خواہ دوگنی قیمت ادا کرنی پڑتی، مگر بہتر نسخہ خریدتے، قرآن پاک بہتر سے بہتر طباعت کے مہیا فرماتے، کلکتہ کے بہترین کارخانہ میں بھیجکر اعلےٰ قسم کی جلدیں بندھواتے تھے!

۵ محرم الحرام ۵۷ھ کو ایسے بیمار ہوئے کہ آخر وقت تک پاؤں سے معذور رہے دل و دماغ البتہ صحیح رہے، اور اس حالت میں بھی سلسلہ درس و تدریس جاری رہا۔

وفات سے دس یوم پیشتر تک حدیث کے اسباق ہوتے رہے۔ زندگی ہی میں عرصۂ دراز سے گورِ غریباں کو اپنا مسکن بنا لیا تھا احباب کے اصرار سے وہیں ایک مختصر مکان بن گیا تھا، جس کی تکمیل دارالعلوم کی اس رقم سے ہوئی، جو کمیٹی نے بطورِ اعترافِ خدمات مولانا کو پیش کی تھی، اسی مکان میں مولانا کا انتقال ہوا ہزارہا مسلمانوں نے نمازِ جنازہ میں شرکت کی، جنازہ کی چارپائی میں لمبی لمبی بلیاں باندھی گئیں تھیں بیک وقت پچاسوں مسلمان کندھا دیتے تھے پھر بھی ہجوم اور لوگوں کے اشتیاق کی کوئی حد نہ تھی خواجہ اجمیری کی درگاہ میں مسجد شاہجہانی کے زیرِ سایہ تدفین ہوئی، قبر میں اتارتے وقت در و دیوار، اور درختوں پہ انسانوں کا ہجوم تھا۔ پسماندگان میں دو بچے (مولوی عبدالباقی صاحب اور ایک صاحبزادی) اور ایک بیوہ ہیں!

اجمیر کی قیام کی مدّت ۳۴ سال اور کل مدّت حیات ۶۰ سال ہے۔

"یہ کیسا عجیب اتفاق ہے کہ ٹھیک عاشورہ محرم میں جب لوگ واقعۂ کربلا سے سوگوار تھے، اس شہید علم و عمل نے دنیا سے کوچ کیا۔ اور اجمیر میں اہل دل نے دوہرے محرم کا سوگ کیا۔"![۱۸]

●●●●●

نبی اکرم کی اصل جلالتِ قدر اور عظمتِ شان کو
کوئی نہیں جان سکتا، مختصراً یہی کہا جاسکتا ہے کہ
"بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر"
ہمارے لیے اصل قابل غور مسئلہ یہ ہے کہ:
کیا ہم آپ کے دامن سے صحیح طور پر وابستہ ہیں؟
اس لیے کہ اِسی پر ہماری نجات کا دار و مدار ہے
اس اہم موضوع پر
ڈاکٹر اسرار احمد کی مختصر لیکن نہایت مؤثر تالیف
نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے
ہمارے تعلق کی بنیادیں
کا خود بھی مطالعہ کیجیے اور اس کو پھیلا کر تعاون علی البر کی سعادت حاصل کیجیے
ہدیہ فی نسخہ: تین روپے۔ تبلیغی مقصد کے لیے یکمشت سو نسخے پر ۳۳ فی صد کمیشن دیا جائے گا۔

بعثت انبیاء و رسل کا اساسی مقصد ـــــ اور
بعثت محمدی کی امتیازی و تکمیلی شان ـــــ نیز
انقلاب نبوی کا اساسی منہاج ـــــ
ایسے اہم موضوعات پر
ڈاکٹر اسرار احمد
کی
حد درجہ جامع تصنیف
نبی اکرم کا مقصدِ بعثت
کا مطالعہ کیجیے
اعلیٰ سفید کاغذ ○ عمدہ طباعت ○ قیمت فی نسخہ ۳ روپے
مرکزی انجمن خدام القرآن ○ ۳۶ کے ماڈل ٹاؤن لاہور

بقیہ: حرفِ اوّل

حاصل ہے وہ یہ کہ ہم دنوں اور سالوں کا حساب رکھ سکیں اور اس طریقے سے اپنی زندگی کے ادوار کا تعین کر سکیں۔ فرماتے ہیں:

مری صراحی سے قطرہ قطرہ نئے حوادث ٹپک رہے ہیں
میں اپنی تسبیحِ روز و شب کا شمار کرتا ہوں دانہ دانہ!

اس شعر کے مصرعہ ثانی میں اقبال نے جس خیال کو پیش کیا ہے اس حقیقت کو قرآن مجید نے بڑے پرشکوہ انداز میں بیان فرمایا ہے۔ یہ سورۃ بنی اسرائیل کی ۱۲ویں آیت ہے کہ:

وَجَعَلْنَا اللَّيْلَ وَالنَّهَارَ آيَتَيْنِ فَمَحَوْنَا آيَةَ اللَّيْلِ وَجَعَلْنَا آيَةَ النَّهَارِ مُبْصِرَةً لِّتَبْتَغُوا فَضْلًا مِّن رَّبِّكُمْ وَلِتَعْلَمُوا عَدَدَ السِّنِينَ وَالْحِسَابَ

(ترجمہ) "اور ہم نے رات اور دن کو دو نشانیاں بنایا، پس ہم نے رات کی نشانی تو دھندلی کر دی اور ہم نے دن کی نشانی کو روشن بنایا تاکہ تم اپنے رب کے فضل کے لئے کوشش کرو اور تاکہ تم سالوں کی تعداد اور حساب معلوم کر سکو۔"

اسی طرح قرآن نے وقت یا زمان کے حوالے سے جو عملی رہنمائی دی ہے وہ یہ ہے کہ یہ دراصل ایک مہلتِ عمر ہے اور وقفۂ امتحان ہے یہی انسان کا اصل سرمایہ ہے۔ اسی میں اپنی عاقبت کو سنوارنا یا بگاڑنا ہے۔ چنانچہ نوعِ انسانی کو جھنجھوڑنے اور غفلت سے بیدار کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ نے اسی 'وقت' کو بطور گواہ کے پیش کیا ہے۔ اور اس کے حوالے سے راہِ نجات کی نشاندہی فرمائی ہے:

وَالْعَصْرِ ۝ إِنَّ الْإِنسَانَ لَفِي خُسْرٍ ۝ إِلَّا الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ ۝

اسی حقیقت کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بایں الفاظ ادا فرمایا:

كُلُّ النَّاسِ يَغْدُو فَبَائِعٌ نَفْسَهُ فَمُعْتِقُهَا أَوْ مُوبِقُهَا۔

"ہر شخص جو صبح کرتا ہے وہ اپنے نفس کو بیچتا ہے (یعنی اپنے اوقات اور صلاحیتوں کی قیمت وصول کرتا ہے) پھر اپنے دن بھر کے اعمال کے نتیجہ میں یا تو اپنے نفس کو آخرت کے عذاب سے چھٹکارا دلا دیتا ہے یا پھر (اعمالِ بد کے نتیجے میں) اپنے نفس کو ہلاکت سے دوچار کر لیتا ہے۔"

اللہ تعالیٰ ہم میں وقت کی قدر و قیمت کا احساس پیدا فرمائے اور ہمیں توفیق دے کہ ہم اس سرمائے کو اس طور سے خرچ کریں کہ جب روزِ قیامت ہم اٹھائے جائیں تو ہمارے ہاتھوں سے عذاب سے چھٹکارے کا پروانہ ہو (آمین)

سیرتِ نبویؐ کے ضمن میں دو۲ عظیم تحفے

ڈاکٹر اسرار احمد

صدر مؤسس، مرکزی انجمن خُدّام القرآن لاہور و امیر تنظیمِ اسلامی
کے دروس و تقاریر کے دو۲ مجموعے اعلیٰ دبیز کاغذ پر خوشنما طباعت کے ساتھ!

رسولِ کامل صلی اللہ علیہ وسلم

یعنی پاکستان ٹی وی سے نشر شدہ ۱۲ تقاریر کا مجموعہ اور

فرائضِ دینی اور اُسوۂ رسولؐ

سُورۂ احزابؐ رکوع ۲، ۳ کی روشنی میں

تبلیغی مقاصد کے پیشِ نظر ۞ ہدیہ صرف چھ روپے فی کتاب ۞ محصول ڈاک علاوہ

مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن ۳۶ کے ماڈل ٹاؤن لاہور

فون — ۸۵۲۶۱۱

ذیلی دفتر: ۱۱ داؤد منزل ـ نزد آرام باغ، کراچی ۱ ـ فون برائے رابطہ ۲۱۴۷۰۹

Regd. L. No. 8193

'HIKMAT-E-QURAN' MONTHLY LAHORE

Vol. 4 | JANUARY 1986 | No. 11

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

کے قیام کا مقصد

منبعِ ایمان ——— اور ——— سرچشمۂ یقین

قرآنِ حکیم

کے علم و حکمت کی

وسیع پیمانے ——— اور ——— اعلیٰ علمی سطح

پر تشہیر و اشاعت ہے

تاکہ اُمّتِ مسلمہ کے فہیم عناصر میں تجدیدِ ایمان کی ایک عمومی تحریک برپا ہو جائے

اور اس طرح

اسلام کی نشأۃِ ثانیہ ——— اور ——— غلبۂ دینِ حق کے دورِ ثانی

کی راہ ہموار ہو سکے

وَمَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ